Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

ملک مقبول احمد

فہرست

......☆......

دیباچہ

سچ پوچھئے تو جس پر جو گزُرتی ہے۔ وُہ خود ہی اس کو خُوب بیان کرتا ہے۔ تو اب اسدُ اللہ خاں غالب کی زندگی اور پھر اُس کا بیان خود اُس کی زبانی اُس میں جس قدر بھی دلآویزی ہو کم ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ مِرزا غالب نے اپنی داستانِ زندگی کسی کتاب کی صُورت میں خود نہیں لکھی۔ لیکن اہلِ ادب واقف ہیں۔ کہ ان کی زندگی کے حالات ان کے خطوط سے بخوبی آشکار ہیں۔ ''سرگزشت غالب'' میں ''اُردوئے معلّیٰ'' ''پنج آھنگ'' ''دستنبو اوُ'' ''عِود ھندی'' سے ایسی تمام عبارتیں اِنتخاب کر کے یک جا کی گئی ہیں۔ کہ جن سے مرزا غالب کی زندگی کے حالات کا مکمل انکشاف ہوتا ہے۔ اور ان کی خودنوشت یا آپ بیتی مرتب ہو جاتی ہے۔ غالب کی زندگی دراصل ایک مرقع ہے۔ ان گونا گوُں واقعات و حالات کا جن کا مُظاہرہ ہم آئے دِن کیا کرتے ہیں۔ کبھی غم و الم کی طُغیانی، کبھی بے پایاں مُسّرت کبھی بادہ نوشی، کبھی فاقہ مَستی، کبھی ''رنگا رنگ بزم آرائیاں'' اور کبھی آہ وزاریاں لیکن اس ساری تصویر میں کچھ ایسی رعنائیاں ہیں۔ کہ ہماری آنکھیں

محوِ دید ہیں۔ اور بقول محمدؐ جان قدسیؔ

دربرم وصال تو بہ ہنگام تماشہ
بظّارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد

سرگزشتِ غالب سے مرزا صاحب کے صرف عادات و خصائل ہی معلوم نہیں ہوتے بلکہ مُلک کی سیاسی و مُعاشرتی و اقتصادی حالت کا بُہت کچھ پتہ چلتا ہے۔
اُس خُدائے سُخن کا حقیقت نگار قلم اپنے ادبی و تمدّنی ماحول کی سچّی ترجمانی کرتا ہے۔
اس (خودنوشتہ) سوانح عمری میں بعض ایسی عبارتیں جن میں دوسروں سے تخاطب ہے۔ اور ان کا نام بار بار آیا ہے۔ نظر انداز کرنی پڑیں۔ بعض خطوط میں تاریخ درج نہ تھی اور دوسرے خطوں سے بھی یہ نہ پتہ چلا کہ وہ کب لکھے گئے۔ اس سبّب سے بعض واقعات سے دست کش ہونا پڑا۔ چند دِلچسپ مقوُلے جو اُردو خطوط میں منتشر تھے چُن کر ایک جگہ جمع کیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب بعنوان ''سرگزشت غالب'' ۱۹۳۹ء میں مرتب کی گئی تھی۔ اس کا مسّودہ بتاریخ ۱۸ اگست ۱۹۳۹ء لکھنو میں مکملّ ہوا تھا۔ اِسی زمانے میں جناب مولوی عبد الحق صاحب، سیکریڑی انجمن ترقی اُردو نے اس کو دیکھا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں جناب مولوی صاحب موصوف کا ممنون ہوں کہ اُنہوں نے چند کارآمد مشورے بھی دیئے۔ میں پروفیسر سیّد مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے صدر شعُبہ فارسی واُردو لکھنو یونیورسٹی کا بھی شُکر گزار ہوں۔ کہ اُنہوں نے بھی بعض مُفید باتیں بتلائیں۔ حیرت ہوتی ہے۔ کہ باوجُود ایسے کرم فرماؤں کی ہمّت افزائی کے یہ کتاب اب تک شائع نہ ہو سکی۔ لیکن نہیں اس میں کچھ میری ہی کوتاہی و غفلت کو دخل ہے۔ اور اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا۔ اگرچہ اب تک کے عرصے میں مرزا غالب کے متعلق متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن جہاں تک مُجھے عِلم

ہے۔مرزا کی آپ بیتی خود اُن کے الفاظ میں بغیر کسی حاشیہ آرائی کے ان تک کسی نے نہیں پیش کی۔ناسپاسی ہوگی اگر اُن رسالوں اور کتابوں کا ذِکر نہ کیا جائے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں۔اور جن کے اقتباسات سے اب ہم نے فائدہ اُٹھایا ہے۔مثلاً ''مکاتیب غالب'' مولانا امتیاز علی عرشی۔'' نادر خطوطِ غالب''از رسا ہمدانی رسالہ ''ھندوستانی'' ورسالہ ''اُردوٗ''۔وُہ کتابیں جن کے مطالعہ سے میں مستفید ہوا حسب ذیل ہیں۔

یادگار غالب۔مرزا غالب۔غالب نامہ۔غالب نکات غالب۔غالب کا روزنامچہ اور ادبی خطوط مرتبہ مرزا احمد بشیر۔جن سے میں نے سب سے زیادہ استفادہ کیا بلکہ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مرزا صاحب موصوف سے استفادہ کئے بغیر اس کتاب کا مکمل ہونا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن نہایت مختصر تھا۔جس کی ضخامت ۲۰×۳۰ سائز کے ۹۴ صفحات تھی۔اب میں نے نظر ثانی کے ساتھ ساتھ حالات میں اضافہ کر کے ضخامت زیادہ کی ہے۔اور ایک بات جو پہلے ایڈیشن میں نہیں تھی وہ یہ تھی کہ مرزا غالب کے جن خطوط اور مضامین کے اقتباسات سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے ان کا حوالہ حواشی میں درج کیا گیا تھا۔چوں کہ میری رائے میں اس سے حالات کے تسلسل اور دلچسپی میں غیر ضروری رکاوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا۔اسی لئے ان حواشی کو حذف کر دیا گیا ہے۔اور دیباچہ میں ''کتابیات'' کے تحت تمام حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔امید ہے کہ قارئین کرام کے لئے یہ مختصر کتاب دلچسپی کے ساتھ معلومات میں اضافہ کا باعث بھی ہوگی۔

جدید واضافہ شدہ ایڈیشن کی تاریخ تکمیل ۴۵ ریواڑ گارڈن ۔ ۱۵ جولائی ۱۹۹۰ء مطابق ۲۱ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

عشرت رحمانی

پہلا باب

پیدائش

میں اٹھویں رجب ۱۲۱۲ء میں پیدا ہوا ہوں۔

خاندانی حالات

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء نہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوایف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنو جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا

گیا۔ نصراللہ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہوگئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا بریگیڈئیر ہوا۔ ایک ہزار ذات کا لاکھ ڈیڑھ لاکھ رسالہ برطرف ہو گیا۔ مِلک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مر گیا۔

باپ اور چچا کے انتقال کے بعد

اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاءِ حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال اس میں سے میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال ۔میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا کہ کولبرک صاحب رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہوئے سکریٹری گورنمنٹ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ ان کے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولیعہد تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ کہ نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دیکر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

باندے جانا

میرا ایک بھائی کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین

حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمشیر زادہ بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا
دودھ پیا تھا۔ وہ باعث ہوا تھا میرے باندا بوندیل کھنڈ آنے کا۔

باندے سے کلکتہ کا سفر

سر کے درد اور تکلیف کا اثر باندہ ہی سے نہ رہا تھا...... دوشنبہ کو موڈہ سے روانہ ہوا۔ بیل
گاڑی جس کو اس ملک میں لڑھا کہتے ہیں اسباب لے جانے کیلئے ملی۔ چونکہ مجھ سے بھی
زیادہ کمزور تھی لہذا وہ آہستہ خرام بلکہ مخرام بارہ کوس کی راہ طے نہ کر سکی اور موڈہ سے چلہ تارا
تک نہ پہونچی...... سہ شنبہ کو آخر شب روانہ ہوا اور میں وہ گھڑی دن چڑھے چلّہ تارا کی کاروا
ل سرا پہونچا۔ اسی مقام سے کشتی کرایہ کی لے کر آدمی اور سامان اُسی میں بھر کر بسم اللہ مجریہا
دمرسہا پڑھ کر جمنا کے دھارے میں ڈال دی۔ ارادہ یہ کہ الہ آباد پہونچکر تھوڑی دیر بنارس ٹھہر
سکوں۔ بنارس خوب شہر ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور چراغِ دیرؔ
اس کا نام رکھا ہے۔ بنارس کے ناخدا شناس ملاحوں نے کشتی دینے میں تکرار کی۔ کلکتہ تک کا
سو روپے سے کم نہیں مانگتے تھے اور پٹنے تک کے بیس روپے سے زیادہ چاہتے تھے۔ ناچارا
سی گھوڑے پر سوار جنگل کا راستہ طے کروں گا۔ چونکہ کشتی کا خیال ابھی ہے لہذا پٹنہ پہونچکر
تلاش کروں گا......

کلکتے پہونچنا

بُدھ کے دن چہارم شعبان کو کچھ دن نکلا تھا کہ کلکتے پہونچا۔ خدائے بے منت کی بندہ
نوازیوں پر مجھے ناز ہے کہ ایسے شہر میں ایسا مکان مجھ کو ملا جس میں ہر طرح کا آرام ہے۔
میں جس مکان میں اترا ہوں شملہ بازار میں ہے۔

کلکتے کی آب و ہوا

خدا کی رحمت ہے کہ کلکتہ کی آب و ہوا میرے موافق ہوئی۔ اس خطّہ میں ایسے آرام
سے ہوں جیسے وطن میں رہا ہوں۔

(رُباعی)

غالب ہر پردہ نوائے دارد　　ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد
پر چید یو بست ار دماغم یکسر　　بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

ایک ادبی ہنگامہ

اس مقام کے سخنوروں اور نکتہ رسوں نے مجھ خاکسار کی آمد پر ایک بزم سخن آراستہ کی۔
ہر انگریزی مہینے میں بروز یک شنبہ بہترین شعرا سرکار کمپنی کے مدرسے میں جمع ہوتے اور
ہندی و فارسی غزلیں پڑھتے۔ اتفاق سے ایک بزرگ جوہرات سے سفیر ہو کر تشریف لائے
تھے اسی انجمن میں آئے اور میرے اشعار سن کر بآواز بلند تعریف کی اور اس ملک کے شاعر
وں کے کلام پر چُپکے چُپکے مُسکراتے رہے۔ چونکہ طبیعتیں خود نمائی پسند کرتی ہیں اس لئے حسد
کرتی ہیں۔ بزرگان انجمن و فرزانگانِ فن نے میری دو بیتوں پر نادرست اعتراض کئے اور
ان کو مشہور کیا۔ اس سے پیشتر کہ میں جواب دوں مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خاں و مکرمی و
مطاعی مولوی محمد محسن نے جواب دیئے اور وہ لوگ خاموش ہو بیٹھے۔ چنانچہ ان ہی بزرگوں
کے کہنے سے میں نے ایک مثنوی کہی اور اپنے اظہار عجز و انکسار کے بعد اس مثنوی میں
اعتراض کے جواب دیئے۔ اس مثنوی (یعنی مثنوی ''بادِ مخالف'') کو ایک عالم نے پسند کیا۔

خلعت ملنا

نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال

معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی ۔ سات پارچے اور چیغہ سرپیچ مالائے مردارید یہ تین رقم کا خلعت ملا ۔ زاں بعد جب جب دلّی میں دربار ہوا مجھ کو یہی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے ۔ میری بریت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی ۔ تین برس بعد پنڈ چُھٹا ۔ اب خلعت معمولی ملا۔

خطاب

نوابی کا مجھ کو خطاب ہے نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امراء مجھ کو نواب لکھتے ہیں۔

دوسرا باب

خاندانی میل جول

(منشی شیونراین) کے دادا کے والد عہد نجف خاں و ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے ۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو (شیونراین صاحب کے) پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی ۔ یہ باتیں میرے ہوش کے پہلے کی ہیں

منشی بنسی دھر

مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اورانہوں نے جو کٹھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعوی کیا ہے تو بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں ۔ میں اور وہ ہم عمر تھے ۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہیں یا چھوٹے ہیں ۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُنکی ۔

شطرنج کا شوق۔ذاتی مکان

باہم شطرنج اوراختلاط اورمحبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھر اُن کا بہت دُور نہ تھا۔اس واسطے جب چاہتے تھے۔ چلے جاتے تھے۔بس ہمارے اوراُن کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جواَب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہےاسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیاوالی حویلی اورسلیم شاہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اوراس سے آگے بڑھ کرایک کڑہ کہ وہ گڈریوں والامشہور تھااورایک کڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔

پتنگ کا شوق

اس کڑہ کےایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھااورراجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے.......

عہد شباب

جب جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ورلوگ اسکی ستائش کیا کرتے تھے۔اب جو کبھی مجھ کووہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے.....جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پرنظر آنے لگے۔اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔

داستانِ عشق

بھئی مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔جس پر مرتے ہیں اسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے۔ چالیس

بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔باآنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔اس فن سے میں بیگانہ محض ہوگیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

ایک نصیحت پر عمل

پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ۔مزے اُڑاؤ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو۔شہد کی مکھی نہ بنو۔سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر معرفت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حویلی۔ اقامت جاودانی ہے اور اس نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔اس تصورّ سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔چشم بددور۔وہی ایک حور۔

شادی

۷رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے پاس حکم دوام حبس صادر ہوا۔ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈالدی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔اللہ اللہ ایک وہ کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اُوپر پچاس برس سے چو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔

اولاد

میں لم یلد ولم یولد ہوں۔چھہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے۔لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔

زین العابدین خاں عارف اوران کے بچے

زین العابدین خاں عارف میرے سالے کا بیٹا مرحوم میرا فرزند تھا اوراب اس کے دونوں بچے میرے پوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں۔ اور دمبدم مجھ کوستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھ کو دوپہر سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں۔ کہیں خاک اُڑاتے ہیں میں نہیں تنگ آتا۔

باقر علی خاں و حسین علی خاں

لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ بڑا لڑکا باقر علی خاں......میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں.....وہی حسین علی خاں جس کا روزمرّہ ہے "کھلونے منگا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا" کبھی میرا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں۔ کبوتر۔ بیڑیں۔ تکل۔ کنکوا۔سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپیہ لے کر دس دن میں اُٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ "دادا جان! کچھ ہم کو قرض حسنہ دو"۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے مہینہ دور ہے۔ دیکھئے کے بار قرض حسنہ لیں گے۔ خدا نے لا ولد رکھا تھا شکر بجالاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلے داری کی شکل کا نتیجہ ہے یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں پڑ گیئں۔ خیر اس کا کیا رونا ہے۔ یہ قید جاودانی ہے۔

تیسرا باب

کرایہ کا مکان

میرا مکان گھر کا نہیں ہے کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسین خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی ہے۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ وہ حویلی خالی کردو اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمد گر ایسی کہ ایک محلسرا اور ایک دیوانخانہ ہو۔ نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلّی ماردں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جارہوں۔ نہ ملا۔

کڑوڑا والی حویلی

(مرزا علاؤالدین خاں بہادر) کی چھوٹی پھوپی نے بیکس نوازی کی۔ کڑوڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محلسرا سے قریب ہو مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جارہوں گا۔

۱۸۶۴ء میں مکان کی حالت

میں بڑی مصیبت میں ہوں۔محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں پاخانہ ڈھ گیا۔چھتیں ٹپک رہی ہیں (مرزا علاؤ الدین خاں بہادر کی) پھوپھی کہتی ہیں۔''ہائے دبی۔ہائے مری'' دیوانخانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔چھت چھلنی ہے۔ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔مینھ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں

برسات میں نقل مکان کی فکر

اگر تم سے (علاء الدین خاں) ہو سکے تو بھائی سے مجھ کو وہ حویلی رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔برسات گذر جائیگی مرمت ہو جائے گی۔پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔

حویلی کا ملنا

تم نے میانجگری کی بھائی نے برادر پروری کی۔تم جیتے رہو۔وہ سلامت رہیں۔ہم اس حویلی میں تا قیامت رہیں۔اس ابہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینھ کی شدّت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔اس کی دادی بھی گھبرائی۔مجھ کو خلوت خانہ کا دروازہ غرب رویہ اور اس سے آگے ایک چھوٹا سا سہ درہ یاد تھا.......یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محلسرا بنانا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی۔اصیل، کاچھن، تیلن، تبنولن، کہاری، پسنہاری ان فرقوں کا ممر دہ دروازہ رہیگا۔میری اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانہ میں رہے گی۔عیاذاً باللہ وہ لو

گ دیوان خانہ میں آئیں جائیں۔اپنے بیگانے کو ہر وقت پچھلپائیاں نظر آئیں اس سہ دری کو اپنے آدمیوں اور لڑکوں کے مکتب کے لئے ہر گز کافی نہ جانا۔مور اور کبوتر اور دُنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے۔عرفتُ ربیّ بفتح العزائم پڑھا اور چُپ رہا۔

صورت اطمینان

اسباب وحشت وخوف وخطراب نہ رہے۔مینھ کُھل گیا ہے۔مکان مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے نہ لڑکا ڈرتا ہے۔نہ بی بی گھبراتی ہے۔نہ میں بے آرام ہوں۔کُھلا ہوا کا ٹھا چاندنی رات، ہوا سرد۔تمام رات فلک پر مریخ پیشِ نظر۔دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ادھر چاند مغرب میں ڈوبا اُدھر مشرق سے زہرہ نکلے۔صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم۔

برسات کی تکلیف

برسات کا حال نہ پوچھو۔خدا کا قہر ہے۔قاسم خاں کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔چھتیں چھلنی ہو گئیں۔مینھ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ میں۔فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلپچی دھری ہوئی ہے۔

چوتھا باب

خوا ہم از بند بہ زند اں سخن آغاز کنم
غمِ دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

حادثۂ اسیری

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ نا واقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلف ملتا تھا اس نے بھی اغماض کیا اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کی گئی مگر کسی نے نہ سُنی اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا۔ اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریفیں کیں اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک اُس نے خود میری رہائی کی رپورٹ

بھیج دی۔ اگرچہ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑ نہیں سکتا۔ جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزہ کرنا آئین عبودیت ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں ہندوستان میں نہ رہوں رُوم ہے۔ مصر ہے۔ ایران ہے۔ بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ ہے۔ اور آستان رحمتہ العالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سرا صحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا ہے، یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔

رازِ دانا غمِ رسوائی جاوید بلاست — بہر آزارِ غمِ از قیدِ فرنگم نبود
جورِ اعدا رو داز دل بہ رہائی ممکن — طعن احباب کم از خم خدنگم نبود

آغازِ غدر

۱۶ ماہ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق 11 مئی 1857ء کو علی الصباح یکا یک دہلی کی شہر پناہ اور قلعہ کی در و دیوار میں زلزلہ پیدا ہوا یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دہلی آئے سب کے سب بغاوت پر کمربستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر پناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے پہلے سے ان کے ساتھ عہد و پیمان بھی کر چکے ہوں دروازے کھول دیئے اور حق نمک اور حفاظت شہر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخواندہ یا خواندہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان سُبک عنان سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کُھلا ہوا اور دربانوں کو مہماں نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا اور اُن کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی۔ اہل شہر کو جو سرکار انگریزی کے

نمک خوار تھے اور حکومتِ انگریزی کے سایہ میں امن دامان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے
تھے۔ ہتھیار سے بیگانہ۔ تیرہ تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں تیر رکھتے تھے نہ
شمشیر سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کریں۔ اس گوں کے ہرگز
نہ تھے کہ جنگ وجدل کے واسطے کمر بستہ ہوں۔ ان غریبوں نے اپنے آپ کو اس آفت نا
گہانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا اس لئے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔
بندہ بھی انھیں ماتم زدگان میں سے ہے۔ گھر میں بیٹھا تھا کہ شور وغوغا بلند ہوا قبل اس کے
کہ سبب دریافت ہو چشم زدن میں صاحب ایجنٹ بہادر کے قلعہ میں مارے جانے کی خبر
آئی ساتھ ہی معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے ہر گلی کوچہ میں گشت لگا رہے ہیں پھر تو کوئی جگہ
ایسی نہ تھی جو گل اندا موں کے خون سے رنگین نہ ہو......

گولہ باری

انگریزوں کے پاس علاقہ دہلی میں سوائے اس پہاڑی کے جو شہر میں واقع ہے اور کچھ
باقی نہ رہا چنانچہ ان اہل دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور ان پر
زبردست توپیں لگائیں۔ دیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین سے اُڑائی تھیں اُن کو لے جا کر
قلعہ میں نصب کیا اور دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔

شہر پر قبضہ

۱۴ستمبر ۵۷ء کو انگریزی سپاہ نے اس شد ومد کے ساتھ کشمیری دروازے پر گولہ باری
کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھاگڑ پڑ گئی اگرچہ گیارہ مئی سے چودھویں ستمبر تک چار ماہ اور چار روز
کا وقفہ تھا لیکن چونکہ شہر دوشنبہ ہی کے روز ہاتھ سے نکلا اور شنبہ ہی کو پھر قبضہ میں آ گیا۔ اسلئے
کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی دن کے اندر شہر ہاتھ سے نکلا اور ہاتھ میں آ گیا۔

ایام غدر میں

سہ شنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء اس وقت تک میں مع عیال واطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی
بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لئے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ
سکتا۔

بادشاہ کی ملازمت

میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں
خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ وآشوب میں کسی مصلحت میں میں نے
دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بیگناہی پر۔ شہر سے نکالا نہیں گیا۔
میں مع زن وفرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازہ سے باہر قدم نہیں
رکھا۔ نہ پکڑا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی
اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ جان ومال وآبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔

دار وگیر سے محفوظ

دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا، کسی غیر نے نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی
نہیں دی۔ روپوش نہیں ہوں۔ بُلایا نہیں گیا۔ دار وگیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پُرس
ہو تو بُلایا جاؤں مگر ہاں جیسا کہ بُلایا نہیں گیا خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی سے درخواست
ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پاتا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گذرے ہونگے انجام کچھ نظر
آتا نہیں کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔

قیمتی اشیاء

بیگم صاحبہ نے بغیر مجھ سے کہے ہوئے قیمتی اشیاء مثلاً زیور، کپڑے جو کچھ تھے چھپا کر

کالے صاحب پیرزادہ کے مکان بھجوا دیے تاکہ وہاں تہ خانے میں محفوظ رہیں۔ اور دروازہ مٹی سے بند کر دیا۔ جب لشکر کشوں نے شہر فتح کرلیا اور سپاہیوں کو لُوٹ کا حکم ملا تو اس راز کے راز داں نے مجھ سے بتلایا مگر اب وہ ہاتھ سے جا چکا تھا اور اب جانے اور اس کے لانے کا موقع نہ تھا میں نے افسوس کیا اور یوں تسلی دی کہ جانے والی چیز تھی اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئی۔

دوستوں کی آمد و رفت موقوف

غرض کہ ایک مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے۔ انصاف کرو کیسا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب زائد یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بالمکند اس کا بیٹا یہ وہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں جرنیلی بندوبست ہے۔

دلّی

دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔

جامع مسجد

ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دو کانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دار البقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔

دریافت حال

پرسوں میں سوار ہو کر کوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ کے دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔

پنشن اور اس کی موقوفی

۵۳ برس کی پنشن تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و منظوری گورنمنٹ۔ اکیس مہینے سے بند اور سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ اس پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب سُنیے ادھر کی ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر عطیہ شاہی کا اُمیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں اگر گنہگار ہوں۔ گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں مفید اور مقبول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔

حاکم کی بے التفاتی

پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کاغذ بھجوایا چیف سکریٹری بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں ایک پیشکش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے۔ نہ اس کے قبول کی اطلاع نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔

ناداری

اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں بعد اس کے نہ کہیں قرض کی اُمید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للّٰہ راجعون۔

بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں تقسیم کا حکم آ جائے گا۔ دیکھیئے آتا ہے یا نہیں۔ اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں۔

میرا دربار، خلعت دریا بُرد ہو گیا۔ نہ پنشن کو توقع نہ دربار و خلعت کی صورت۔ نہ سزا نہ انعام نہ رسم معمولی قدیم۔

رامپور کا قصد

میں تو پنشن کے باب میں حکم اخیر سُن لوں پھر رامپور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاوّل سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے اور پھر محرم سے ۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس سال کی دو چار حد دس گیارہ مہینے۔ غرض کہ اُنیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرتے ہیں۔ اس میں رنج و راحت و ذلّت و عزّت جو مقسوم میں ہے وہ پہونچ جائے اور پھر علیؑ علیؑ کہتا ہوا ملک عدم چلا جاؤں۔ جسم رامپور میں اور روح عالم نور میں۔

میرٹھ کا سفر

میں مصطفےٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے واپس آیا۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

نیا حکم

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدّت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ

بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے آٹھ دن قید رہتا ہے۔

ٹکٹ

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے۔ ''ٹکٹ آبادی درون شہر نہ شرط ادخال جرمانہ''۔ مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے...... سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ ''بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ یہ کہ اسد اللہ پنشندار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالہ والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے وقت میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنیل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر اُس کی اقامت کا مدار ہے اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔''

نواب مصطفےٰ خاں

نواب مصطفےٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ بمجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔

رئیس فرخ آباد

مجھ کو رشک آتا ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اُتار کر سرزمین عرب پر چھوڑ دیا۔ اہاہاہا۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

سکے کا وار

سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرّا یا گولی مگر اب کس سے کہوں کس کو، گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گذارے بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے انھوں نے دلّی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سُنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گذادنے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہیں آیا۔ یہ دھبّہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا

چوں جنبش سپہر بہ فرمان دادرست
بیداد نبودانچہ بما آسماں دہد

میں نے سکّہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ بھی ہے تو ایسا کیا سنگین ہے بلکہ معظّمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بینک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہوجائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔

پانچواں باب

نا اُمیدی

کہتے ہیں کہ خدا سے نا اُمیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے نا اُمید ہوکر کافر مطلق ہوگیا۔ موافق عقیدہ اہل اسلام جب کافر ہوگیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ ''غالب سے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں لے اب تو قرضہ داروں کو جواب دے۔'' سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا بڑا کافر ملا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشیمن خطاب دیئے میں چونکہ یہ اپنے کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا۔ سقرمقر اور ہادیہ زاویہ خطاب تجویز کررکھا ہے۔

بھائی کا انتقال

میرا حقیقی بھائی میرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔

زسال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف — کہ زیستی بجہاں درز خویش بیگانہ
یکے درانجمن از من ہمی پژوہش کرد — کشیدم آہے و گفتم دریغ دیوانہ

کیس پنشن اور کہاں اس کا ملنا یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔

ہو موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اُس کی بیٹی، اس کے چار بچے اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔ اب خاص اپنا دُکھ روتا ہوں۔ ایک بی بی۔ دو بچے تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز یہ باہر مداری کے جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے۔

نوکر

میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ بی وفادار.... اب (مرزا علاء الدین خاں کی) پھوپھی نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں۔ سودا کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیدھ نہ کریں گی۔ ممکن نہیں دروازہ کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں "پھون تائی چچا کے بیٹے کے کائی کے ایں۔" (شرح) تمہارے چچا کے بیٹے کی

کیاری کے ہیں۔

مفلسی اور فکریں

ایک پیسہ کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر سدر مق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلے جاتی ہے۔ آدمی ہوں۔ دیو نہیں۔ بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں۔ بڑھاپا ضعفِ قوی۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھکر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ۔ دربار میں جاتا تھا خلعت فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں نہ بیگناہ ہوں نہ گنہگار ہوں۔ نہ مخبر نہ مفسد اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں۔

قصیدہ

دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دیدیا۔ وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے۔

زسال نو دگرا بے بروئے کار آمد
ہزار و ہشتصد دشست درشمار آمد

جام بے آتش سیال

صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ وہ حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں مگر ہائے آتش سیال کہاں کہ جب دو چرعہ پی لی فوراً رگ وپے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا۔ دماغ روشن ہوگیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم

پہنچا۔ساقی کوثر کا بندہ اورتشنہ لب۔ ہائے غضب۔ہائے غضب۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کوشراب ملتی تھی۔اب صرف روٹی ملتی جاتی ہے۔شراب نہیں۔کپڑا ایّام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔اس کی فکر مجھ کونہیں ہے۔بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کوآ گیا ہے۔اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا۔آئندہ خدارازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملاتو غم تو ہے۔بس صاحب جب ایک چیز کھانے کو ہوئی اگر چہ غم ہی ہوتو پھر کیا غم ہے۔

شراب کی گرانی

آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔عرق کے نہ کھنچنے کی قید شدید نے مارا۔ادھر انسداد دروازہ آبکاری ہے۔ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

غلے کی گرانی

غلّہ گراں ہے موت ارزاں ہے۔میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر۔باجرہ بارہ سیر۔ چنے سولہ سیر۔گھی ڈیڑھ سیر۔ترکاری مہنگی۔

موسم سرما میں ایک دن

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔کھانا تیار ہے۔خط لکھ کر بند کر کرآدمی کو دونگا اور میں گھر میں جاؤں گا۔وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے۔ اس میں بیٹھوں گا۔ہاتھ مُنہ دھوؤں گا۔ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤ نگا بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔باہر آؤں گا۔

جام تہی

جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔کل سے رات کو نری انگیٹھی پر

گذارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔آج دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا کہا ابر گھر رہا ہے۔ترشح ہو رہا ہے۔ہوا سرد چل رہی ہے۔پینے کو کچھ میسّر نہیں۔ناچار روٹی کھائی ہے شعر

افق ہا پُر از ابر بہمن مہی
سفا لینہ جام من اڑمے تہی

چھٹا باب

غالب کا شمار باغیوں میں

۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی اہائی دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا ''میں بھی چلوں'' فرمایا کہ ''نہیں'' جب لشکر میرٹھ سے دلی میں آیا میں اپنے دستور کے موافق روزِ ورودِ لشکر میں گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرٹر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی گیا تھا جواب آیا کہ ہمارے اسلام میں دو اور کہو کہ ''فرصت نہیں ہے''۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا۔ خبر کروائی حکم ہوا کہ ''غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو''۔ عالم نظر میں تیرہ تار ہوگیا۔ یہ پیام نومیدی جاوید ہے۔ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھوا کر ان کو بھیجا۔

صفائی کی التجا

مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کہ تحقیقات ہوتا کہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔

تحقیقات سے انکار

اب ماہ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ''ہم تحقیقات نہ کریں گے'' بس یہ مقدمہ طے ہوا۔ میں گدائے مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہونچے میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیجا مع اس حکم کے واپس آیا کہ ''اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔

کامیابی کی اُمید

نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلّی آئے۔ اہالی شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے میں تو بیگانہ محض اور مطرود احکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا نہ کسی سے ملا۔ دربار ہوا ہر ایک کا نگار ہوا۔ شنبہ آٹھویں فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا۔ بلایا گیا مہربان پا کر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی وہ بھی حاصل ہوئی دو حاکم جلیل القدر وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ (جملہ معترضہ) میر منشی لفٹنٹ گورنر سے سابقہ تعارف نہ تھا۔ وہ بطریق حُسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ جب حکام بجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسن طلب بہ اشارہ حکام ہو گی۔

سانڈرس سے ملاقات

جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے مکلوڈ صاحب حاکم صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظّمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو۔'' حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا۔ وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا ''تم نے کتاب کیسی لکھی ہے'' اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا۔ ''ایک مکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو'' میں نے عرض کیا ''کل حاضر کر دوں گا''۔ پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ بھی گذارش کیا اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔ غرضکہ دوسرے دن یکشنبہ یوم تعطیل تھا۔ میں اپنے گھر رہا۔ دوشنبہ ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی کہا۔ ''اچھا توقف کرو'' بعد تھوڑی دیر کے گڈ کپتان کی چٹھی آئی۔ سواری مانگی۔ جب سواری آ گئی۔ ناہر نکلے میں نے کہا ''وہ کتابیں حاضر ہیں'' ''منشی جیون لال کو دے جاؤ'' وہ اُدھر سوار ہو گئے۔ میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سارٹیفکیٹ گورنروں کے نام کے لے گیا تھا وہ دیکر یہ استدعا کی کہ ''کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے''۔ ''بہت اچھا'' کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے لیا کہ ''ہم نے تمہاری پنشن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا گئے ہوئے تھے۔ کل وہ آئے۔ آج میں نے ان کو خط لکھا ہے جیسا وہ حکم دیں گے اس کے موافق عمل کر دوں گا۔ جب بلائیں گے تب جاؤں گا دیکھو اسداللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ ۲۳ مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمے سے کہ وہ آج سلطنت کا دھندہ ہے ملی۔ صبر و ثبات بھی اُسی

کا بخشا ہوا تھا۔ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا۔

دربار و خلعت کے بحال ہونے کی نوید

بقیہ روداد یہ ہے کہ شنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم قیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ ''تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے''۔ متحیّرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر!'' حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آ کر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس حکم لکھوایا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے'' میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا''۔ فرمایا کہ ''ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ دن یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں'' میں نے کہا سبحان اللہ۔ شعر

کار سازِ ما بفکر کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

گورنر سے ملاقات۔ خلعت و دربار کھل گیا

سہ شنبہ ۳ مارچ کو بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا کہ ''نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے''۔ .... میرا یہ حال ہے کہ علاوہ اس دائیں ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا اُجڈا ہے .... اُٹھنا دشوار ہے بہر حال سوار ہو گیا۔ پہلے سکرٹر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصوّر میں کیا بلکہ تمنّا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت سی عنایت اخلاق سے اخلاق وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ ''ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے

دربار میں تیر المبرا اور خلعت کُھل گیا۔ انبالہ جا دربار میں شریک ہو خلعت پہن۔'' عرض حال کیا گیا۔ فرمایا۔'' خیر اور کبھی کے دربار میں شریک ہو'' اس پھوڑے کا بُرا ہو انبالہ نہ جا سکا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ نہال ہو گیا۔......... جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا۔

کار دُنیا کے تمام نہ کرد
ہرچہ گیرید مختصر گیرید

زرمجتمع ملنے کی رپورٹ

میری پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہ، سمجھ لو ع وللرحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک طرز خاص پر تحریک ہوئی نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کی پنشن کے کلّ چڑھے ہوئے روپے کے یکمشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تا کہ ہم منظوری دیکر تمہارے پاس بھیج دیں سو یہاں اس کی تعمیل بطرز مناسب ہو گئی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا۔ اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ'' اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپیہ خزانہ سے منگوا لو''۔ میں نے کہا صاحب یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو۔ فرمایا کہ'' تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے۔'' میں چُپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر روپیہ منگا لوں پر یاروں ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ رپورٹ کرنے کا بھی آیا مگر یہ حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھئے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔

پنشن کا اجرا۔ زرمجتمع ملا

پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرمجتمع سہ سالہ یکمشت مل گیا۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئے سو(۱۰۰) مدخرچ جو پائے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اُٹھ گئے مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں روپیہ اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ'' میرا حساب کیجئے۔'' حساب کیا۔

قرض کی ادائیگی

سود مول سات کم پندرہ سو روپیہ نکلے۔ میں کہتا ہوں'' یہ گیارہ سو بانٹ دے تو سو بچے۔ آدھے تو لے۔ آدھے مجھے دے۔'' وہ کہتا ہے'' پندرہ سو مجھ کو دو پانسو سات تم لو''۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا تب کچھ ہاتھ آئے گا خزانہ سے روپیہ آ گیا ہے۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا ہو تو آنکھیں پُھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے۔

نہ شام مارا سحر نویدی نہ صبح مارا دم سپیدی
چو حاصل ماست نا امیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

پنشن بطریق شش ماہی

آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آ گیا کہ پنشن داران ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بطریق شش ماہی فصل نہ فصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا..... یہ سود مہینہ تک اسی طرح کڑوا دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ میں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

ساتواں باب

نواب یوسف علی خاں والی رامپور

نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر والی رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں یعنی اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے اصلاح دیکر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ اِدھر آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری۔ انگریزی پنشن کھلی ہوئی۔

نواب کی اُستاد پروری

ان کی عطایا فتوح گنے جاتے تھے جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار اُن کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم سے خواہاں رہتے تھے۔ میں غدر کرتا تھا۔ جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اُوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ چھ سات ہفتہ وہاں رہ کر دلی آیا۔

رامپور کا سفر

میں نے دلی کو چھوڑا اور رامپور چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہونچا۔ آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے یہاں قیام کیا۔ کل شاہجہاں آباد پرسوں گڈھ مکٹیسر رہوں گا۔ پھر مرادآباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا۔

شہر میں افواہیں

میاں میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آ گیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والئی رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو مہینہ کر دیا تھا۔ نواب لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا ”اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے اس کو برطرف کر دیا یہ تو سب سُن لیا اصل حقیقت سُنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس پینتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے دوست ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔

تنخواہ کا تقرر

اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے ہیں۔ اب میں گیا دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادثہ ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بہ شرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا

اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں اب جو میں وہاں گیا تو دوسو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپے۔

نواب صاحب کا برتاؤ

بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ملاقات بھی دوستانہ رہی۔معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے۔لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔بس بہرحال غنیمت ہے۔رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔کمی کا شکوہ کیا۔

دلی سے رامپور کی روانگی۔دوسرا سفر

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار و روزینہ خوار ہے رئیس حال (نواب کلب علی خاں) نے مسند نشینی کا جشن کیا۔دعا گوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رامپور روانہ ہوا۔

غازی آباد سے روانگی

ہفتہ سے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔مقصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیئے۔چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرا میں پہونچا۔دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے پایا......میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔رات ہوگئی تھی شراب پی لی۔کباب کھالئے۔لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی اور خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو کھلائی۔دن کے

واسطے سادہ سالن پکوایا۔ترکاری نہ ڈلوائی۔

مراد آباد پہنچنا

بُدھ کا دن پہر بھر چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مُرادآباد پہنچا۔۲۰/جمادی الاول کی اور ۱۱/اکتوبر کی ہے۔دونوں لڑکے گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔اب آئے جاتے ہیں۔رات بخیر گذری بشرط حیات رامپور پہنچ جائیں گے۔

رامپور کی تعریف

یہ رامپور ہے۔دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔پانی سبحان اللہ۔شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔خدا کی قسم میں یہاں خوش ہوں اور تندرست ہوں۔

مہماں نوازی

ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑنے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔کئی طرح کے سالن پلاؤ۔متنجن۔پسندے۔دونوں وقت روٹیاں خمیری۔چپاتیاں۔مُربے۔اچار۔میں بھی خوش۔لڑکے بھی خوش۔کلّو اچھا ہوگیا ہے،سقّہ۔مشعلچی۔خاکروب سرکار سے متعین ہے حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔

تعظیم۔تواضع۔اخلاق کسی بات میں کمی نہیں۔ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں۔میں خود اُن سے ابتدا کروں گا۔وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے مگر بواسطہ کارپردازان سرکار

دیکھوں مجھ سے کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے پہونچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی لیکن آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہونچنے کو ہے کوئی کلام نہیں ہوا۔

نواب کی مدح

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا۔ سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب ازروے صورت رُوح مجسّم اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوالایا ہے اس کے ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ حلیم و خلیق۔ باذل کریم۔ متواضع۔ متشرع۔ متورع۔ شعر فہم۔ سیکڑوں شعر یاد نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ اب کے دیکھتے سے غم کوسوں بھاگ جائے فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سُن کر نئی روح قالب میں آئے۔

واپسی۔ حالات سفر

بعد اختتام بزم عازم وطن ہوا۔ مُرادآباد پہونچا۔ بعد پالکی کے اوترانے کے پُل کا ٹوٹ جانا۔ گاڑی۔ اسباب۔ یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اس زمہریر کے میدان میں رہنا۔ بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا۔ خیر جو اُن پر گذری وہ جانیں۔ میں مرادآباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا۔ بھوکا۔ پیاسا۔ کمل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی ؂

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر نے دی بردلیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اُٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے۔ اٹھا کر سعیدالدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد محسن خاں بہادر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر وہیں مجھ سے آ کر ملے۔ دوسرے دن وہ رہ گزاری دارالسرور رامپور اور میں جادہ نوردستم آباد دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ ۸/جنوری ۱۸۶۶ء در غمکدہ پر پہونچا۔ حضور (نواب کلب علی خاں) کے اقبال کی تائید تھی ورنہ میں اور جیتا دلی پہونچتا۔

مغلوب غلبۂ غمِ دل غالبِ حزیں	کاندر تنش زضعف تواں گفت جاں نبود
از رامپور زندہ دہلی رسیدہ است	ماراز بن گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

آٹھواں باب

مذہب

میں موحّد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا الہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمدؐ علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور حمتہ اللعالمین ہیں مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام زیستم ہم بریں بگزرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ منکرین و مشرکین نبوت مصطفویؐ اور امامت مرتضویؑ اس میں جلیں۔

اثنائے عشری

صاحب بندہ اثنائے عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ لکھا کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا خاتمہ اسی عقیدہ پر ہو۔

اعتراف

اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔

مرید ہونا

شاہ محمدؐ اعظم صاحب...... خلیفہ تھے مولوع فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ اگر منظور کیجئے تو میں صوفی ہوں ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ بموجب مصرع کے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر ست

یہاں لا موجود الا اللہ کی بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ شعر

کجا غیر و کو غیر و نقش غیر
سوائے اللہ واللہ مافی الوجود

بنی آدم سے محبت

میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔

نواں باب

آم سے رغبت

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں انگور سے کم عزیز نہیں۔ یہ ثمر رب النوع اثمار ہے۔ اس کی تعریف کیا کروں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر نہ سبیل ارمغاں بھیجتے رہتے ہیں اے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی ہے۔ دو ٹوکرے ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے۔

آموں کا آنا

وہ ایک آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا...... باہر تختوں پر آ بیٹھا شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ

اُس کے سر پر ایک ٹوکرا۔ اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا اہاہا سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسید بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہی فیض خاص نہیں لطف عام ہے۔ شراب نہیں آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو سر بمہر گلاس سمجھا۔ بادۂ انگوری سے بھرا ہوا مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا یہ اسّی تھے۔ بندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے۔ تا اس کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے ٹوکرے میں سے پھینک دیئے۔

آم کھانے کا شوق

اُن دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی۔ شیخ محسن الدین مرحوم سے بہ طریق تمنّا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں۔ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدے میں اتنی آموں کی گنجائش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں۔ جو کھاؤں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں۔ اتنے آم کھاتا کہ پیٹ بھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آدم پڑے ہوئے تو پانچ سات۔

دریغا کہ عہد جوانی گذشت
جوانی مگو زندگانی گذشت

شراب

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاسن ٹیلن اور ایک اوڈ لٹام۔ یہ میں ہمیشہ پیا کرتا

تھا۔اور یہ دونوں بیس روپیہ حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔اب یہاں پہلے تو نظر ہی نہیں آتی تھی اب پچاس اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے اور یہ گڑ چال کی شراب میں نہیں پیتا۔مجھ کو مضرت کرتی ہے۔اور مجھے اس سے نفرت ہے۔

فرنچ

میں آدھا مسلمان کہ جو مذہب وملّت کے بندوں سے بھی آزاد ہوں اور اپنی بدنامی کا بھی غم نہیں رکھتا ہمیشہ سے عادی ہوں کہ رات کو سوائے فرنچ کے اور کچھ نہیں پیتا اور اگر وہ مجھ کو نہ ملی تو بات نہ کرتا۔اس زمانہ میں کہ شراب بہت مہنگی ہے اور پیسہ پاس نہیں۔اگر جوانمرد خدادوست خداشناس دریادل مہیش داس بادہ شکری ہندی جو رنگ میں فرنچ کی سی ہے اور خوشبو میں اس سے اچھی بھیج کر میری دہکتی ہوئی آگ پر پانی نہ ڈالتا تو جان نہ بچتی اور جگر کی آگ میں بھُن جاتا۔

روزمسّرت

مولانا غالب علیہ الرحمہ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی جلد بوستان خیال کی آگئی ہے۔سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشہ خانے میں موجود ہیں۔دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔

کسے کیں مرادش میسر بود
اگر ہم نباشد سکندر بود

محدود آمدنی

وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو مارا ادھر خوب چند چین

سکھ کی کوٹھی جالوٹی ہر ایک پاس تمسک قہری موجود۔شہد لگاؤ۔چاٹو۔نہ مول نہ سود۔اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر باایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا کبھی الور سے کچھ دلوایا۔کبھی سو روپے رامپور کے۔قرض دینے والا ایک مختار کار۔وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔انکم ٹیکس جُدا۔چوکیدار جُدا۔سود جُدا۔مول جُدا۔بی بی جُدا۔بچے جُدا۔آمد وہی ایک سو باسٹھ۔تنگ آگیا۔گذارہ مشکل ہوگیا۔روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔سوچا کہ کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں۔قہر درویش بر جان درویش۔صبح کی تبرید متروک۔چاشت کا گوشت آدھا۔رات کی شراب وگلاب موقوف۔بیس بائیس روپیہ بچا۔روزمرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا ''تبرید وشراب کب تک نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے''۔جواب دیا۔''جس طرح وہ جلائیں گے''۔

خرچ بدستور

بارے مہینہ پُورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔قرض قسط ادا ہوگیا۔متفرق رہا۔خیر ہو۔صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہوگئی۔گوشت پُورا آنے لگا۔

دسواں باب

رنج والم

آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔عقل جاتی رہتی ہے۔اگر ہجوم غم میں میری قوتِ متذکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے۔غمِ مرگ۔غمِ فراق۔غمِ رزق۔غمِ عزت۔میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔مظفر الدولہ میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجہ۔اس کا بیٹا احمد مرزا۔ انیس برس کا بچہ مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں قاضی فیض اللہ کیا میں اپنے عزیزوں کے برابر نہیں چاہتا تھا۔ اے لو بھول گیا۔حکیم رضی الدین خاں۔میر احمد میکش۔اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں۔

غمِ فراق

غمِ فراق حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے۔

کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہو کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم نظر میں تیرہ و تار ہے۔

دوستوں کی یاد

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں کچھ گئے۔ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔

قتلِ احباب کا رنج

میاں میں کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ انگریز کی قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست۔ کچھ شاگرد۔ کچھ معشوق

ہندوستانی احباب

سو وہ سب سے سب خاگ میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتمدار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اَب میں مروں گا تو کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔

الکنڈر مدرنی

الکنڈر مدرنی مشہتر بہ الک صاحب مرگیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔

میجر جان جاکوب

ہائے میجر جان جاکوب کیا جون مارا گیا ہے۔ سچ اس کا یہ شیوہ تھا کہ اُردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انھیں میں سے ہے جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے کس کو یاد کروں۔ کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

دوستوں کے لئے دعا

اس راہ سے جو مجھ کو دوست اب باقی ہیں سب عزیز ہیں واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا بھی تو دُنیا میں ہو۔

ہرگول پال تفتہ

مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔

منشی نول کشور

منشی نول کشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے

اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ ''اگر میں دنیا دار ہوتا تو اسکو نوکری کہتا مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپیہ یعنی لماصہ سال انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو روپیہ سال رامپورے اور چوبیس روپیہ سال اِن مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ یہ دو برس سے ہو مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں قیمت نہیں لیتے مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیتا ہوں۔

شیو جی رام و بالمکند

شیو جی رام برہمن بر ہمانژاد سمجھدار جوان ہے اور میرے لئے بجائے فرزند کے ہے..... اس کا لڑکا بالمکند سیدھا اور پارسا نوجوان ہے۔ اپنے باپ کی طرح سے وہ بھی فرمانبرداری میں چست اور غم خواری میں یکتا ہے۔

دو مخلص دوست

ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں ستّر ہزار آدمی نظر سے گذرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں سے عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص الولا دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمتہ اللہ علیہ۔ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ۔ لیکن وہ مرحوم حُسن صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص خاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوسرا خیر خواہ خلق حسن و جمال چشم بددور کمال مہر و وفا صدق و صفا نورٌ علیٰ نور میں آدمی نہیں ہوں آدم شناس ہوں۔

نگہم نقب ہمیزد بہ نہاں خانہ دل
مژدہ باد اہل دیار اکہ زمیداں رفتم

گلہ چرخ

اس چرخ کج رفتار کا بُرا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ مِلک و مال و جاہ جلال کچھ نہیں

رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بینوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے۔ بیت

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یادرہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

فرخ مرزا

پرسوں فرخ مرزا آیا۔ اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ''کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟'' ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ ''حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں۔'' پھر میں نے پوچھا کہ ''تمہاری تنخواہ آئی؟'' کہا ''جناب عالی! اکا جان کی تنخواہ آ گئی ہے۔ میری نہیں آئی۔'' میں نے کہا ''لوہارو جائے تو تنخواہ پائے''۔ حضرت، میں تو اکا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے سبحان اللہ! بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔ میں اس کی خوبی خُو اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اسکو فرخ سیر کہتا ہوں۔

میر حسن

آج جمعہ کا دن ۲۸ ؍ جمادالثانی اور ۱۱ ؍ جنوری کی صبح کے وقت منہ اندھیرے اُسی وقت آنکھ کھلی تھی۔ لحاف میں لپٹا ہوا پڑا تھا کہ ناگاہ میر نصیر الدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ ''اب میں جاتا ہوں اور..... میر حسن جے پور سے آئے اور خدا جانے کہاں اُترے اور اب کہاں جاتے ہیں''۔ ہے ہے مجھے غیر سمجھا کہ میرے ہاں نہ آئے اور مجھ سے نہ ملے۔ اپنی سسرال میں رہے اور میکے کو چھوڑا۔ واللہ میرا جی ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا تھا۔ اب اٹھا ہوں

۔ سردی رفع ہوے۔ دھوپ نکل آئے۔ آغا جان کے ہاں آدمی کو بھیجتا ہوں۔ میں کمبخت بھی تو نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے ہیں۔ اب میر احمد علی کی بی بی کے پاس حبش خاں کے پھاٹک آدمی بھیجوں گا جب آغا جان کے گھر کا پتہ معلوم ہو جائے گا اور آدمی دیکھ آئے گا اور یہ بھی معلوم کر آئے گا کہ میر حسن ہیں تو میں سوار ہو کر جاؤں گا اور اُن سے ملوں گا۔

دوستوں کی فریب دہی

امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا خدا جانے کہاں کے رہنے والے کسی زمانے میں وارد اکبر آباد ہوئے تھے۔ کبھی کہیں کے تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔ زبان کے چالاک اکبر آباد میں نوکری کی۔ کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں دو ایک بار آئے تھے۔ پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی آ رہا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا حافظہ برقرار تھا۔ میں نے جانا کہ یہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں مجھ کو پہلے یہ مصرع لکھا۔

از بختِ شُکر دارم از روزگار ہم

آپ سے جُدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا۔ وہاں سے دو برس بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنو میں آیا ہوں۔ وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے بادشاہ نے خان اور بہادر کا خطاب دیا ہے۔ مصاحبوں میں نام لکھا ہے۔ مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے

قصیدہ در مدح امجد علی شاہ

اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں وزیر کے

نام لکھ کر میرے پاس بھیجد یجئے گا تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصہ میں ایک قصیدہ لکھا جس کی بیت اسم یہ ہے بیت

امجد علی شہ آنکہ بہ ذوقِ دعائے او
صدر ہ نما صبح قضا کرد روز گار

متردد تھا کہ کس معرفت بھیجوں۔ تو کلّت علی اللہ بھیجدیا۔ رسید آ گئی صرف۔ پھر دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا۔ وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ بائین شائستہ پیش کر نے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مہر کن سے میری مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجئے، چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیجدیا۔ رسید آئی اور قصیدہ کے بادشاہ تک گذرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینے تک اُدھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں ہے۔ ایک مدّت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط بہادری کہ مہرتم سے بہ فریب حاصل کر کے مرشد آباد چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دوسو روپے دیئے تھے۔

قصیدہ در مدح نصیرالدین حیدر

قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے توسط سے نصیرالدین حیدر کے پاس گذرا اور جس دن گذرا اسی دن پانچ ہزار روپے کے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا کہ ''خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا''۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گذری۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ

ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیئے۔ اور فرمایا کہ ''اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا۔ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپیہ بھی نہیں بھیجے۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ ''اب تم مجھ کو خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا اور مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ قصیدہ حضور میں سے گذرا مگر میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔'' بھائی میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔ تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیرالدین حیدر مر گئے۔ اب کہو میں کیا کروں وہ ناسخ کیا کرے۔

لکھنؤ کی تباہی

ہائے لکھنؤ۔ کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سرد پا وہاں پہنچا امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصل خزاں ہے۔

عزیزوں سے برگشتگی

میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یا دشت قبچاق میں سو یا دوسو ہوں گے ہاں مگر اقربائے سبی ہیں سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں۔ اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں

گردہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہما نا زِ جہاں بر خیزد

اللہ اللہ دریا سارا تیر چکا ہوں ساحل نزدیک ہے۔ وہ ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مرگئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

گیارھواں باب

قولنج کا دورہ ۱۸۵۸ء

بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارۂ ریوند اور رانڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا مگر قصہ تمام نہ ہوا.........دس دن میں دوبارہ آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک غذا تناول فرمائی گلاب اور املی کا پینا اور آلو بخارے کا افشردہ اس میں مدار رہا۔ کل سے خوفِ مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی بظر آئی ہے۔

قلعہ وفات ۱۸۵۹ء

بس اس سے زیادہ پاس کی ہوگی کہ بامید مرگ جیتا ہوں اس راہ سے کچھ مستغنیٰ ہوتا چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گذر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام

سمجھئے۔بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے۔قطعہ

من کہ یاشم کہ جاہ داں باشم　　　چونظیری نماند وطالب مرد

ور بگویند در کدامیں سال　　　مرد غالب بگو کہ غالب مرد

اب بارہ سو پچھتر ہیں اور غالب مرد کے بارہ سو ستّر ہیں۔اس عرصہ میں جو کچھ مسّرت پہنچنی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں

ناتوانی ۱۸۶۰ء

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکّما کر دیا ہے۔ضعیف، سستی، کاہلی۔گرانجانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہی اگر ناپُرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر باز پُرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہادیہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کس کا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک لطیفہ

رات میں پلنگ پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ میر مہدی پاس بیٹھے تھے اُٹھ کر پاؤں دابنے لگے۔ میں نے کہا کہ ''تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے''۔انھوں نے نہ مانا اور کہا کہ'' آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پاؤں دابنے کی اُجرت دے دیجئے گا۔''اس کا مضائقہ نہیں جب پیر داب چکے تو اُجرت طلب کی ۔ میں نے کہا ''بھیا! کیسی اُجرت۔تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہارے پیسے دابے۔حساب برابر ہوا۔

زندگی سے بیزاری

۱۲۷۷ھ میں میرا مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔مگر اس تین برس میں ہر روز

مِرگ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائرقفس میں۔کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں آتا۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ یہ جو لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع۔

آں روز کزیں منزل ویراں بردم

عوارض فساد خون ۱۸۶۳ء

مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا بائیں پاؤں میں ورم کفِ پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر نہ اُٹھا۔روٹی کھانے کا محلسرا نہ گیا۔ کھانا نہیں منگالیا اور حوائج کو کیا کروں ۔ یہ سب موقع خیال سوچ لو کے کیا گذرتی ہوگی

پیری وصد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چُپکے پڑھتا ہوں

اے مرگ نا گہاں تجھے کیا انتظار ہے

مرگ ناگہانی اب کہاں رہی۔اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے۔

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

۱۸۶۳ء

ایک برس سے عوارض فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے وقت

پلنگ سے اُتر لیتا ہوں۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔

۱۸۶۵ء

بوڑھا، بہرا۔ اپاہج۔ بدحواس ناتوان۔ فلک زدہ آدمی ہوں۔ تین برس عوارض اختراق خون میں ایسا مبتلا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی۔

قولنج کا دورہ ۱۸۶۶ء

پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا۔ ضعیفِ بصارت ضعیفِ معدہ۔ ان سے ضعیفوں پر ضعیف طالع........ایک دو ہفتہ کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں حالت جان میں نہیں۔ پیری وصد عیب۔ ساتویں دھاگے کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دوری تھا اب دائمی ہو گیا ہے۔ غذا کم ہوتے ہوئے اگر معدوم نہ کہو تو بمنزلہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ گرمی میں میرا حال بجنسہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانور کا۔ خصوصاً اس تموز میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہے۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں مگر صبح سوتے وقت تک نہیں جانتا کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں۔

اصلاح سے معذوری

ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاعر

شرف بوعلی قلندر کو سبب کبرسن کے خدا نے فرض اور پیمبرؐ نے سنت معاف کر دی تھی متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔

غذا

اس مہینے سے یعنی رجب کی آٹھویں سے تہتر واں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ قریب شام کو کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے میں خانہ ساز اور اسی قدر شیرہ۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اُٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چار پایہ بن کر اُٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر میں رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اُٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ مشہور ہے کہ یہ بات کے جو کوئی اپنے کسی عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے موتے کی روح کو اس کی بُو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینے پر تھی اب دنوں پر ہے۔

زندگی سے مایوسی ۱۸۶۷ء

آگے ناتواں تھا اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرہ تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رعشہ و ضعیف بصر۔ چار سطریں لکھیں اُنگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ اکہتر برس جیا بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں کی نہیں۔ دنوں کی ہے۔ اب میں چراغ سحری ہوں۔ رجب ۱۲۷۸ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتر واں سال شروع ہو گیا۔ طاقت سلب۔ حواس مفقود۔ امراض مستولی۔ میں ایک قالب بے روح ہوں۔ بقول نظامی

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں ہوتا ہوں۔ مجھ کو دو آدمی ہاتھوں میں اُٹھا کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری اُس میں ڈال دیتے ہیں تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں شام کو پھر بدستور دو آدمی لیجا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔

دلی کے اخبار

ہاتھ میں رعشہ آنکھوں میں ضعف بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ بھائی اب میں تو دن کا مہمان ہوں اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں۔ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں سوان کے اخبار میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تو ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اور اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج۔ بہرا، آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔ ستر ابھتر ا بوڑھا اپاہج آدمی ہوں۔ اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا کہا تک جیوں گا۔

ضعف ۱۸۶۸ء

ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں جیسا کہ ابر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ آگے اپنی طاقت تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا اب وہ طاقت بھی زائل ہوگئی۔ ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی ضعیف ہوگئی متصدی کو رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے اب کوئی صاحب وقت پر آ گئے تو مطلب کہتا گیا اور وہ لکھتے گئے۔

تہتر واں سال

میری تہتر برس کی عمر ہے بس میں احزاف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہوگیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر۔ دو پہر گوشت کا پانی۔ سر شام تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب حزف ہو۔ پوچ ہوں عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصّہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

تصویر کھنچوانے سے انکار

صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھچا کھچا پھروں۔ گوشہ نشین آدمی عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈھوں۔

مصوروں کی شکایت

تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصور صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اُتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ اُتروانے نہیں آئے میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشہ اُتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ''بھائی میری شبیہ کھینچ دو'' وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ پانچواں مہینہ ہے۔ آج تک نہیں آئے۔

تصویر کا گُم ہونا

آج منگل ۱۹/جون ۱۸۶۷ء ۱۲ بجے عنایت نامہ (از شاہزادہ بشیر الدین صاحب) آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدہ صبح مُراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال ہوا کہ ننگا نہ ہوتا تو گریباں پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو کھنچوا کر بصورت تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا......اس فرمان میں اس لفافہ کی رسید نہ پائی۔ ظاہرا ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکر بے روح کے ٹکڑے اُڑا دیئے

بارھواں باب

تعلیم

میں نے ایام دبستاں نشینی میں ''شرح مانۃ عامل'' تک پڑھا۔ بعد اسکے لہو ولعب اور آگے بڑھکر فسق وفجور وعیش وعشرت میں منہمک ہو گیا۔

اُردو میں شاعری کی ابتداء

خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے

شاعری

بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہو مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوانین پیش نظر رکھ لئے ہوں صرف بحر وردیف وقافیہ تو دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل اور قصیدہ لکھنے لگا.......... بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں

بیدل کی تقلید

ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل واسیر وشوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ اس غزل کا مقطع تھا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین لکھا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔

میری شاعری ملکئہ فطری ہے۔ میں نے شاعری میں خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکئہ شاعری نے خود مجھے مجبور کیا کہ میں اس کو اپنا فن قرار دوں۔

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

کلام کا ضائع ہونا

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کُتب خانے برباد ہوگئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک دن فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رُونا آیا۔ غزل

ایک غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہوں کیوں رقیبونکو	اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے	لیکے دل دلستاں روانہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما	کام گر رک گیا روانہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب	گالیاں کھا کے بدمزہ نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُس کی تھی	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

نئی زمین

بس پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اردو دیوان اور غزلیں

اُردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اُن میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم واکمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آ جائے لے لو۔

ایک بات اور.........خیال میں رہے کہ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔ ایک دوست کے پاس اُردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اُس نے کہیں کہیں سے مسوّدات متفرق بہم پہونچائے ہیں چنانچہ ''پنہاں ہوگئیں۔'' ''ویراں ہوگئیں'' یہ غزل مجھکو اُس سے ہاتھ آ گئی ہے۔

منشی ممتاز علی

جب میں رام پور سے میرٹھ آیا بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے مکان پر اُترا۔ وہاں منشی ممتاز علی خاں صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے انھوں نے کہا کہ اپنا اُردہ کا دیوان مجھ کو بھیجد یجیے گا۔ عظیم الدین کتب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے........دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا ہاں میں نے عذر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیجد یا تھا اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اُردو لے کر اُس کو کسی کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیجدینا۔ آمدم برسر مطلب سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی خاں نے کہا کہ ''میں''.........دلی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیجدیا۔

لکھنؤ کے چھاپے کی تعریف

دیوان اُردو چھپ چکا تھا۔ لکھنؤ کے چھاپے خانہ نے جس کا دیوان چھاپا اُس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حُسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور چھاپے پر لعنت ہے صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرتے ہیں جیسے کسی کو کتّے کی آواز دے۔ ہر کاپی کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا۔ متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان

چھپ چکا۔

کاتبوں کی شکایت

حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا اور وہ چھپا۔ ہائے خدا کی مار کاتبان ناہنجار پر۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیا ناس کر کے چھوڑ دیا۔

اُردو نثر لکھنے میں عار

جناب ہندی اسٹورٹ ریڈ صاحب.........ان کی فرمائش ہے اُردو نثر کی وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو لکھوں مگر بھائی تم غور کرو اُردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کرونگا اور اس عبارت میں معنی نازک کیونکر بھروں گا۔ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر اور کیا تدبیر کروں۔ ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے۔ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میری اُردو بہ نسبت اوروں کی اُردو سے فصیح ہوگی۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو۔ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں۔ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔

خطوط سے شوق

میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے..... مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے۔ محلّہ کی ضرورت نہیں۔

فارسی میں خطوط لکھنا موقوف

زبان فارسی میں خطوط لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سالی وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔شعر

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اُردو میں خطوط

سب دوستوں کو جن سے کتاب رہتی ہے اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے ان میں سے جو صاحب الی الآن موجود ہیں ان سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتب ومراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔

القاب وآداب

خط میں بڑے بڑے القاب وآداب سے میں خوش نہیں ہوتا۔جب تعلق ونسبت قوی ہوجاتی ہے تو پھر آداب کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

طرزِ تحریر

میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطالب نویسی پر مدار رکھا ہے۔میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے۔ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔کیوں سچ کہیو! اگلوں کے خطوط کی یہی طرز تھی۔ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔جب یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔چاہ بے آب ہے۔ابر بے باراں ہے۔نخل

بے ثمر ہے۔خانہ بے چراغ ہے۔چراغ بے نور ہے۔ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں۔

رقعات کے چھاپے جانے سے انکار ۱۸۵۸ء

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے.......یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔

تذکرۂ شعرائے ہند

رمٹکین صاحب .... تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔مجھ سے انہوں نے مدد چاہی۔میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے ان کا حال لکھ بھیج۔میں نے ۱۶ آدمی لکھ بھیجے بقید حیات ان کے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اُس سواد کی صورت یہ ہے نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو فارسی واُردو دونوں میں شعر کہتے ہیں۔فارسی میں نیر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں۔اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں اور اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔منشی ہرگوپال معزز قانون گو سکندر آباد کو فارسی شعر کہتے ہیں۔تفتہ تخلص کرتے ہیں ۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد.......اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔صرف شاعر کا نام اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن وموطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔

تیرھواں باب

فارسی سے عشق

نظم ونثر فارسی کا عشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی میں بہت کچھ لکھا۔

مشق سخن

علم و ہنر سے عاری ہوں۔لیکن پچپن برس سے محوِ سخن گذاری ہوں مبدا فیاض کا مجھ پر احسان عظیم۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی وسرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔مناسبت خداداد تربیت اُستاد، حُسن وقبح ترکیب پہچاننے فارسی کے غوامض ماننے لگا۔ بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا فرہنگوں سے بڑھکر کوئی ماخذ مجھکو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ ناگاہ ایک شخص کہ سامان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق وفلسفہ میں مولوی فضل حق

مرحوم کا نظیر اور مومن وموحد وصوفی صافی تھا۔ میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔ فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ لطائف فارسی بُحت اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اُس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین وخاطر نشان ہوگئی۔

اہل زبان کی تقلید

میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صایب وکلیم واسیر وحزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اُس کو نظم ونثر میں نہیں لکھتا۔

اصولِ تکمیل فارسی

فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسب طبیعت کی ہے پھر تتبع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف وشعرائے ہندوستان کے یہ اشعار سوائے اس کے کہ اُن کی موزونی طبع کا نتیجہ کہئے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی وعنصری فرقانی ورشید واطواط اور ان کے امثال ونظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔

فارسی نظم ونثر

ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو میرے سبھی بھائی اور میرے شاگرد رشید بھی ہیں۔

جو نظم ونثر میں نے کچھ لکھا وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا چنانچہ کلیات نظم فارسی جو چوّن پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز اور اُردو دیوان ریختہ سب مل کر سوسوا سو جزو مطلیٰ اور مذہّب اور انگریزی ابرے کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دوسو روپیہ کے صرف میں بنوائی۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اس مجموع نظم ونثر کی نقل کی۔

کتب خانوں کی بربادی

اب وہ جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لُٹے اور دونوں جگہ کا کتاب خانہ خون نعیما ہوگیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔

پنج آہنگ

چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بدوعیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کردی ہے کہ میرا جی چاہتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

ماہِ نیم مادہ مہر نیمروز

اکثر صاحب اطراف وجوانب سے ماہ نیم ماہ بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں۔ اور میں جی میں یہ کہتا ہوں کہ جب مہر نیمروز کی عبارت کو نہیں سمجھتے تو وہ ماہ نیم ماہ کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب! نیمروز کے دیباچہ میں میں نے یہ لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام ''پرتوستان'' ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلعتِ عالم سے ہمایوں کی سلطنت کا

ذکر دوسرے حصہ میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان پہلے حصّہ کا نام ''مہر نیمروز'' دوسرے حصہ کا نام ''ماہ نیم ماہ'' ہے۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا۔ چھاپا گیا۔ جا بجا بھیجا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تمر تک نام ونشان مٹ گیا۔ آن دفتر را گاؤ خورد وگاؤ را قصاب بُرد وقصاب در راہ مُرد

قاطع برہان

۱۸۶۱ء یعنی سال گذشتہ میں ''قاطع برہان'' چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مول لیں۔ اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی ''برہان قاطع'' میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزار ہا لغت غلط، ہزار ہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارت پادر ہوا۔ میں نے سودوسو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا اور ''قاطع برہان'' اس کا نام رکھا ہے۔

کلیات فارسی

فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا۔ مگر ہاں سال گذشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محبت سے جمع کیا تھا وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو میں یعنی کوئی مصرع میرا اُس سے خارج نہیں۔ اب سُنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہوگیا۔

دستنبو

میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۱۳ جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد نثر میں بعبارت فارسی ناآمیختہ بعربی لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر کے مسطرے چار جزو کی کتاب آگرہ کو مطبع مفید الخلایق میں اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدہ کے بیان سے کام رکھا ہے۔ اور ایک قصیدہ متعارف عربی وفارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظّمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر

کے ساتھ شامل ہے۔کتب دستنبو کے بِک جانے سے میں خوش ہوا.........

دستنبو کی خریداری

آخر یہ جنس پڑی نہ رہی بِک گئی۔ بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان میں سیکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔جو زندہ ہیں اُن کی مقدور نہیں ۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئے ہوگی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہونگی۔ یورپ میں کم بکی ہوں گی۔

فارسی کا طرز تحریر

کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیا۔میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت کم پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔نثر میں بھی یہی حال ہے۔نواب مصطفٰے خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظہ کے بموجب جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے۔اس کو دیکھ کر فقط ایک بیت۔ان کا نام اوران کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔واللہ باللہ۔

فارسی نثروں کی اشاعت

فارسی مکتبوں اور رسالوں اورنسخو ں اور کتابوں کے مجموع اجزا چھاپا ہو کر اطراف واقصائے عجم میں پھیل گئے۔حال کی نثروں کو کون فراہم کرے۔ جو نثریں کہ مجموع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہوگئی ہیں۔اور آئندہ ہوں۔اُن کو جناب احدیت جلت عظمتہ مقبول قلوبِ اہلِ سخن ومطبوع طبائع اربابِ فن فرمائے۔

چودھواں باب

ایک میزان

میں فارسی کا محقق ہوں ۔ایک میزان عرض کرتا ہوں ۔ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لیکر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔ رودکی وفردوسی سے لیکر خاقانی وثنائی وانوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ان حضرات کا کلام تھوڑی تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔خیالہائے نازک ومعانی بلند لایا۔اس شعوۂ کی تکمیل کی ظہوری ونظیری وعرفی ونوعی نے سبحان اللہ! قلب سخن میں جان پڑ گئی۔اس روش کو صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربہ دیا۔صایب وکلیم وسلیم وقدسی وحکیم شفائی اسی زمرہ میں ہیں اور رودکی داسدی وفردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترکیب ہوا اور سعدی کے طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔فغانی کا انداز پھیلا اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہونے لگے۔تو اب طرزیں تین ٹھہریں۔خاقانی اس کے اقران ظہوری اس کی امثال

صایب اسکے نظارہ خالصاً ممتاز واختر وغیرہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ ان کی طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے۔ خوب طرز ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے۔ ٹکسال باہر ہے داد داد۔ انصاف انصاف۔

ایک فارسی غزل

ایک فارسی غزل جو ابھی کہی ہے اسی ورق میں لکھتا ہوں.......غزل کو اپنے احباب بزم کے روبرو پڑھیئے اور عرض کیجئے کہ ہندوستانی فارسی زبان میں اس طرح کہتا ہے۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

بگوشۂ بنشینیم ودر فداز کنیم
بہ کوچہ برسر رہ پاسباں بگردانیم

اگر زشحنہ بود دارو گیر نندیشم
گرز شاہ رسدار مغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود مہماں بگردانیم

گل افگنیم وگلابے برہ گذر پاشیم
می اوریم وقدح درمیاں بگردانیم

ندیم ومطرب دساقی ز انجمن رانیم
بکاروبار زنی کارواں بگردانیم

گہی بہ لابہ سخن باادا بیامیزیئم
گہی ببوسہ زباں در دہاں بگردانیم

نہیم شرم بیک سوی وباہم آویزم
بشوخئی کہ رُخ اختراں بگردانیم

ز جوش سینہ سحر را نفس فرد بندیم
بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

بوہم شب ہمہ راد بیند ازیم
زنمیہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

بجنگ باج ستاناں شاخسارے را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

بہ صلح بال فشانان صبحگاہے را
زشاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

زحیدریم من وتو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے آشیاہ بگردانیم

بمن و صال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

ادبی صحبت

قلعہ میں شہزادگانِ تیمور جمع ہو کر کچھ غزلخوانی کر لیتے ہیں.......میں کبھی اس غزل خوانی میں جاتا ہوں کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چندروزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم ہے کہ اب کی نہ ہوا اور ابکے ہو تو آئندہ نہ ہو۔

مشاعرہ

جمعہ کی شب کو بزمِ سخن آراستہ ہوئی۔ میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی اس لئے مشاعرہ میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نواب ضیاءالدین احمد خاں نے زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محمور کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کر دیا۔ وہ دونوں شام کو ہاتھی لے کر میرے مکان پر آئے اور مجھے سوار کر کے لے گئے۔ وہاں پہونچکر مولانا صدرالدین آزردہ کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہوگئی۔ صہبائی نے طرحی میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دلنشیں تھے۔ عارف اور جوہر نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے

صبح شد خیز کہ روداد اثر نمایم
چہرہ آغشتہ بہ خوناب جگر نمایم

یہ غزل سُنائی۔ آئندہ مشاعرہ کے لئے ''گریبانم نمی آید'' و ''دامانم نمی آید'' طرح ہوئی ہے۔

دوسرا مشاعرہ

اُردو کے بہت سے شاعر جمع تھے اور انہوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدر

الدین آزردہ بیمار تھے اس لئے شریک مشاعرہ نہ ہوئے۔ جب میری باری آئی پہلے میں نے
''ملک نخواست''، فلک نخواست'' پڑھی۔ پھر غزل طرحی پڑھی۔

چہ عیش از وعدہ چوں باور زعنوانم نمی آید
بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

مشاعرے میں آئندہ کے لئے عرفی کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا۔

صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اس زمین میں طالب آملی نے قصیدہ کہا۔ عرفی نے دو غزلیں۔ اب اس میں غالب
بے نوا سے کیا زمزمہ سنجی چاہتے ہیں۔

تیسرا مشاعرہ

شام ہوئی تو وہی فرشتے یعنی عارف ومحو آکر مجھے لے گئے میر امام الدین ممنون اور
مولوی امام بخش صہبائی بہ سبب علالت نہ آئے۔ حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا
وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر تشریف لے آئے۔ میں نے طرحی زمین میں قصیدہ لکھا تھا اور سوچ
رہا تھا کہ اس قصیدے کو ''برات نامقبول'' کی طرح ناخواندہ واپس لیجاؤں اور اُردو کے
شعرا کو دردسر نہ دوں لیکن حضرت آزردہ لانے سے دل مطمئن ہو گیا اور میں نے قصیدہ پڑھنا
ضروری سمجھا۔

چوتھا مشاعرہ

جمعہ کی شب ۲۵ رفروری کو بادشاہ کا حکم پہونچا کہ سب شاعر قلعہ میں جمع ہوں۔ چنانچہ
خاندان بابری کے شہزادے اور دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست گاہ
میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ سب سے پہلے سلطان الشعرا شیخ محمدؐ ابراہیم ذوق نے بادشاہ کی

غزل پڑھی۔ پھر شہزادہ خضر سلطان نے اپنی غزل سنائی۔ ان کے بعد میرزا حیدر شکوہ
میرزا نورالدین اور میرزا عالی بخت عالی نے اپنا کلام سُنایا۔ عالی کے پاس ہی میں بیٹھا
ہوا تھا۔ میں نے اپنی غزل دس شعر کی پڑھی۔ صہبائی کے شاگردوں میں سے محوی نام ایک
نوجوان نے ''نشید مستانہ'' لگائی۔ میرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر زمین طرحی میں
سُنائے۔ میں پیشاب کے بہانے سے وہاں سے اُٹھا اور اپنے گھر چلا آیا۔ دو کانوں کے کُھلے
تھے۔ چراغ روشن تھے۔ شراب پی اور سو رہا۔ صبح قلعہ میں گیا تو چاروں شہزادے جن کے نام
اوپر مرقوم ہیں جمع تھے۔ انھوں نے رات والی غزلیں سُنائیں۔ میں نے اپنی غزل دوبارہ
پڑھی۔ وہیں سُنا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ سب سے آخر میں سلطان الشعرا نے دو
غزلیں سُنائی تھیں۔

اعتراضات

میں نے سات شعر امیر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیئے وہ مجلسوں میں گانے
لگا۔ اکبرآباد و لکھنؤ تک مشہور ہوئے۔ وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

از جسم بجاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

ایک صاحب آگرہ میں اور ایک صاحب لکھنو میں معترض ہوئے کہ ''گنج اور
خرابہ باید نہ درخراب''۔ ہر چند کہا کہ خرابہ مزید علیہ اور اصل لغت خراب عربی الاصل
بمعنی ویراں و ویرانہ ہے جس کی ہندی اُوجڑ۔ معترض مصر رہا۔ صایب کے دیوان میں
یہ مطلع نکلا۔

بہ فکر دل نہ فتاوی نہ ہیچ باب دریغ
بہ گنج راہ نبردی دریں خراب دریغ

فرہنگ نویس

غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے اگرچہ قاطع برہان میں جا بجا لکھتا ہوں۔ مگر اب ہندہ کی چندی کر کے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف ونحو عربی بقدر تحصیل مسلم اور اُستاد ہیں۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طرز ہیں۔ یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز کے چھلکے۔ جس قدر اُتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ مغز نہ پاؤ گے فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے جاؤ لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم۔

پندرھواں باب

معیار کلام

اگر اس راز اور پردۂ ساز (یعنی سخنوری) کے سمجھنے کی آرزد ہے تو ریختہ کہنے والوں میں گفتار میر و میرزا اور فارسی شعرا میں صایب۔ عرفی۔ نظری اور حزیں کا کلام پیش نظر رہے مگر ایسی نظر نہیں کہ آنکھیں تحریر اوراق دیکھیں اور دل کو خبر نہ ہو بلکہ ساری کوشش اس میں صرف ہو کہ ہر لفظ کو سمجھیں اور فروغ معنی دیکھیں۔ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کریں۔

شعرائے اُردو کی مدح

اگرچہ شاعران نغز گفتار　　زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں　　خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیز درگر پارسیوں کے حصّے میں آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز

پائی ہے میر تقی علیہ الرحمہ

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو — رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار — خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گرانکا

قائم اور تجھے طلب بوسہ کی کیونکر مانوں — ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیزنشتر ہیں مگر ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔

ناسخ

شیخ امام بخش طرز جدید کے موجد اور پُرانی ناہموار دشوں کے ناسخ تھے۔ میرے بھی دوست صادق الوداد تھے مگر یک فنی تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی سے اُن کو کچھ علاقہ نہ تھا۔

سرور کا ایک شعر

رجب علی بیگ سرور نے جو ''فسانہ عجائب'' لکھا ہے۔ آغاز داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزادیتا ہے۔

یاد گار زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فساد ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور ''یاد رکھنا'' اور فسانے کے واسطے کتنا مناسب۔ کیا خوب مطلع کہا ہے''

اسد کا مطلع

ایک شخص نے مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا ''قبلہ! آپ نے کیا خوب مطلع کہا

ہے۔''

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے یہ سُن کر عرض کی کہ ''صاحب! جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شعر اور بُت اور جفا اور وفا میری طرز گفتار نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گذرے ہیں یہ مطلع یہ غزل اُن کے کلام معجز نظام میں ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔

غالب تخلص

میں نے کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں۔

کلکتہ میں ایک قطعہ

وہ جو (فعلاتن فلعن) یہ بحر ہے۔ اس میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب میرے ایک دوست تھے انھوں نے ایک مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لے لی۔ اب سوچ رہا ہوں کہ جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہئے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اِسے کیا کہئے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجئے
خالِ مشکینِ رُخ دلکش لیلےٰ کہئے
حجر الاسودِ دیوار حرم کیجئے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہئے
صومعہ میں اسے ٹھہرایئے گر مہر نماز
میکد ے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہئے
مسّی آلودہ سرانگشتِ حسیناں کہئے
سر پستانِ پرِ یزادسے مانا کہئے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔اشعار سب کب یادرہتے ہیں اخیر کی بیت یہ ہے بیت

اپنے حضرت کے کفِ دست کودل کیجئے فرض
اور اس چکنی سُپاری کو سو یدا کہئے

کلکتہ کا ارمغاں

حضرت !وہ شعر بنگالی زبان کالو ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں۔صحیح یوں ہے

تم کہے تھے رات میں آئیں گےسوآئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھراس غم سے کچھ کھائے نہیں

فنِ تاریخ سے نفرت

فنِ تاریخ کو دودنِ مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور (مرزا تفتہ) کی طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔اس کو سب جانتے ہیں

کہ میں مادۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔لوگوں کے مادّے دیئے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔

ایک اُردو غزل

وکیل حاضر باش دربار اسد اللہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اُردو غزل لکھوائی۔اگر پسند آئے مطرب کو سکھائی جائے۔جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔

غزل

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی
تم ہو بُت پھر تمہیں پندا رخدائی کیوں ہی
تم خدا وند ہی کہلا وَ خدا اور سہی
حُسن میں حُور سے بڑھ کر کبھی ہونے کے نہیں
آپ کا شیوہ واندازو ادا اور سہی
تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ ایک اور سہی قبلہ نما اور سہی
کوئے دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس دوزخ ملا لیں یا رب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضااور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آب بقا اور سہی
مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیدار گرِ رنج فزااور سہی

اصلاح شعر

بریلی اور لکھنو اور کلکتہ اور بمبئی اور سورت سے اکثر حضرات نظم ونثر ہندی اور فارسی میں بھیجتے رہتے ہیں۔ میں خدمت بجالاتا ہوں اور صاحب میرے حک واصلاح کو مانتے ہیں۔کلام کاحُسن وقبح میری نظم میں رہتا ہے اور ہرایک کا پایہ اور دستگاہ فن شعر میں معلوم ہوجاتا ہے۔فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں۔فن شعر میں اگراس شیوہ کی رعایت کی جادے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے فقیر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کلام میں اغلاط واسقام دیکھتا ہوں تو رفع کر دیتا ہوں اور اگر سقم سے خالی پاتا ہوں تو تصرّف نہیں کرتا۔ جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں۔ اس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تا کہ آئندہ صاحب کلام اس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔

تعلیم وتلقین

کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول داستوار جو زباندان ہوگا وہ سمجھ لے گا۔غلط فہم وکج اندیش لوگ نہ سمجھیں نہ سمجھیں۔ ہم کو خلق کی تہذیب وتلقین سے کیا علاقہ۔تعلیم وتلقین واسطے دوستوں یاروں کے ہے نہ واسطے اغیار کے۔

شعر کے لئے کیا چاہیے؟

ضاعت شعر اعضاو جوارح کا کام نہیں۔ دل چاہیے دماغ چاہیے۔ ذوق چاہیے۔ اُمنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں لاؤں جو شعر کہوں۔ چونسٹھ برس کی عمر دلولۂ شباب کہاں یہ رعایت فن اس سے اسباب کہاں۔ اِنّا للہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

سولھواں باب

عہد ضعیفی میں

میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہ گیا ہوں ۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں.......شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بُھول گئے مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک قطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

زندگی اپنی جب شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چُپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یادگزشتگان

نظام الدین ممنون کہاں۔ ذوق کہاں۔ مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ دسخندانی۔ کس برتے پرتا پانی۔ ہائے دلی۔ وائے دلی۔ بھاڑ میں جائے دلی۔

عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بوڑھا پہلوان

۶۵ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلال قویٰ ضعف دماغ۔ فکر مرگ۔ غم عقبیٰ.......نظم ونثر کا کام ۵۰ برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے ورنہ جو ہر فکر کی رخشندگی کہاں۔ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے زور نہیں دلوا سکتا۔

ناکامی

اب نہ فارسی کی فکر نہ اُردو کا ذکر نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی اُمید۔ میں ہوں اور اندوہ ناکامی جاوید جیسا کہ خود ایک قصیدہ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں۔ شعر

چشم کشودہ اند بہ کر دار ہائے من
زایندہ نا امیدم و از رفتہ شر مسار

شعر گوئی متروک

عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹی کرتا تھا خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف۔ بھٹی متروک۔ نہ غزل نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں۔

نظم ونثر کی ناقدری

ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدر رواں پایا۔ غالب سوختہ اختر کی نثر کی داد نہ ملی۔

کسم نحونہ پذیر فت ودیر بارم برد
چونامہ آنکہ بود نا نوشتہ عنوانش

اگر چہ ایک فتنہ ہوں مگر مجھے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم ونثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا۔ آپ ہی سمجھا۔ قلندری وآزادگی وایثار وکرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جانکلا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا۔ کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آوں نظم

نہ بستاں سرائے نہ میخانہ — نہ دستاں سرائے نہ جانا نہ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط — نہ غوئے رامشگر اں در رباط

خدا کا مقہور۔ خلق کا مردود۔ بوڑھا ناتوان بیمار۔ فقیر۔ نکبت میں گرفتار۔

داد نہ پائی

ایک کم ستّر برس دُنیا میں رہا اب کہاں تک رہوں گا۔ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا۔ ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا تین رسالے نثر کے پانچ نسخے مرتّب ہوگئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ غزل کی داد پائی۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی بقول طالب آملی علیہ الرحمتہ

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

دل ودماغ کی کمزوری

قوت باقی نہ رہی۔ کبھی جو سابق اپنی نظم ونثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران ہوں کہ میں نے یہ نثر کیونکر لکھی تھی اور کیونکر یہ شعر کہے تھے۔ عبدلقادر بیدل کا یہ مصرع زباں سے ہے۔

عالم ہمہ افسانہ مادارد و ماہیچ

پایانِ عمر ہے۔ دل ودماغ جواب دے چکے ہیں۔

غزل وقصید ترگ

اموات میں ہوں۔ مُردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بُھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے رہا قصد ممدوح کون ہے۔ ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے

اے دریغا نیست ممدوح سزاوار مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزا وارِ غزل

ممدوحین

میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدہ میں چلدیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔

طبیعت کی پژمردگی

سچ تو یوں ہے کہ قوتِ ناطقہ پردہ تصرّف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزا سرمستی وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اسی سبب سے فن کلام میں گفتگو کرلیتا ہوں۔ روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھئے وہاں کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گنہگار کیونکر بخشا جاتا ہے۔

پیشینگوئی

میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہونچکر آفتابِ لبِ بام اور ہجوم امراض جسمانی وآلام رُوحانی سے زندہ درگو ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے۔ نظم ونثر کے قلمرو کا انتظام ایزدِ دانا وتوانا کی عنایت واعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی و قائم رہے گا۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بوده است
شهرتِ شعرم به گیتی بعد من خواهد شدن

''ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسوّدے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تُم میرے ہم عُمر نہیں۔ جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دُعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو، مسوّدے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا''

اُو میاں سیّد زادہ آزادہ، دِلّی کے عاشق دِلدادہ ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنو کو بڑا کہنے والے، نہ دِل میں مہر وآزرم، نہ آنکھوں میں شرم وحیا۔

بھائی، تم سچ کہتے ہو۔ بر سرِ فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد۔ نورِ چشم میر مہدی کو بعد دُعا کے معلوم ہو کہ کُلیاتِ فارسی کا پہنچنا مُجھ کو معلوم ہوا۔

ہر خوردار کامگار پر مہدی علی دھلوی، اُردو بازار کے مولوی صاحب لوائے ولائے مرتضوی پر علم عباسؓ ابن علیؓ کا سایہ صاحب، دو خط تمہارے یہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، داڑھی مُنڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے، تمہارا خط آیا۔

یہاں تم کو پنشن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنشن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنشن جاری اور میں تم کو اطلاع نہ دوں؟

میر مہدی تُم میری عادت کو بُھول گئے۔ ماہِ مُبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے میں اس مہینے میں رام پور میں کیوں رہتا۔

جو یائے حال دھلی، سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ جتنلی قبر کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دُکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔

لو صاحب یہ تماشا دیکھو۔ میں تُم سے پُوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کہاں ہیں۔ حالانکہ میر نصیر الدین شہر میں ہیں اور مجھ سے نہیں ملے۔ میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اُترے۔

میاں لڑکے، کہاں پھر رہے ہو؟ اِدھر آؤ، خبریں سنُو۔

اہاہاہا، میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔

آیئے جناب میر مہدی صاحب دھلوی، بہت دِنوں میں آئے کہاں تھے؟ بارے آپکا مزاج تو خوش ہے۔

میری جان، خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو۔ اس کی وجہ میں نہیں سمجھا۔

مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟

’’واہ کیا ہوشمندی ہے۔ کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں۔ نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم،سُن غالب، ہم تجھ سے کہتے ہیں مصاحب نہ بن۔‘‘

’’دن تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں، کاتب کا نام ’’غالب‘‘ ہے۔ کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔‘‘

’’تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں نام بدل کر ’’مغلوب‘‘ رکھ لیا ہے‘‘۔

’’سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے‘‘

’’اچھا تو باز نہیں رکھتے، مگر یہ تُم کیوں نہیں چاہتے کہ میر مہدی کو خط لکھوں؟‘‘

’’کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سُنتا اور خط اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط وہاں جاوے‘‘

’’میاں کیوں ناسپاہی و حق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے۔ کہ کوئی شکایت کرے؟ تمہارا مُنہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں تُم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟‘‘

اہاہاہا میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے۔ یہ دارالسرور ہے۔ جو لُطف یہاں ہے۔ وہ اور کہاں ہے۔

رُقعہ گلگوں نے سیر کی بہار دکھلائی، یہ سواری ریل روانہ ہونے کی ہر دِل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضُعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضُعفِ دِل، ضُعفِ معدہ، ان سب ضُعفوں پر ضُعفِ طالع۔ کیونکر قصہ سفر کروں؟ تین شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟

’’کیوں مہاراج ’’کول‘‘ میں آنا اور خباب مُنشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی

اور ہم کو یاد نہ لانا مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر جانا؟ تُم مجھ کو بُھول گئے۔ کول میں آئے اور مُجھے اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا کہ کیونکر آیا ہوں۔ اور کب آیا ہوں اور کب تک رہوں گا۔ اور کب جاؤں گا۔ اور بابو صاحب سے کب جا ملوں گا۔‘‘

میں حسبُ الطالب نواب صاحب کے دوستانہ آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ اُن کے گورنمنٹ چاہتا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے؟ کتاب (دستنبو) اور عرضی اواسط ماہِ جنوری ۱۸۶۰ء میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ چھ ہفتے جہاز پہنچتا ہے۔ یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔‘‘

’’برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سوادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف دالان کا جو دروازہ تھا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صُبح کے بیٹھنے کا حُجرہ جُھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے‘‘۔

’’تُمہارا حُلیہ دیکھ کر تُمہارا کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے۔ تو چھاتی پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں۔ جی پر کیا گزری‘‘۔

’’جب داڑھی مونچھ پر بال سفید آ گئے، تیرے دِن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیئے اس بھونڈے شہر میں ایک روشنی ہے عام مُلاّ، حافظ، بساطی، نیچہ

مند، دھوبی، سقّا، بھٹیارہ، جولاہا۔ کنجڑا، مُنہ پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دِن داڑھی رکھی، اسی دِن سر منڈایا۔"

"جس نے لیا اُس نے مجھ پر پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اُٹھوں بیدرد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طوٗل ہے۔ اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا، گرمی کی شدت، پاڑ کا قرُب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگرہ ہے۔ اور صبح کو مجھے پھانس مِلے گی۔"

"برسات کا نام آ گیا، سو پہلے تو مجملاً سُنو ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانان کا ایک، آفت وبا کی، ایک مُصیبت کال کی۔ اب برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنُو سمجھ لیتے ہیں۔ مُبالغہ نہ سمجھنا، ہزار ہا مکان گر گئے، سینکڑوں آدمی دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے قصّہ مختصر اور "ان کال" تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ "پن کال" ہے۔ کہ پانی ایسا برسا، بوئے ہوئے دانے بہہ گئے، جنھوں نے نہیں بھی بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سُن لیا دلّی کا حال؟

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدّت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قیادت نہیں ہے لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے۔ جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حولات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو روپے جُرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دِن قید رہتا ہے۔"

"دو تین گھڑی دِن چڑھے احباب کو رُخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار باقر علی اور حسین علی گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیئے۔ چار گھڑی دِن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔

دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دِن رہے قافلہ آیا، میں نے چھٹانک بھر گھی داغ لیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہو گئی تھی، شراب پی لی۔ کباب کھا لیے، لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی، خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دِن کے واسطے سادہ سالن پکوالیا۔ ترکاری نہ ڈالوائی۔ چار پانچ عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سوٗرج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چار پائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حُقہّ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں"۔

"آپ نے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا اگر پیر و مُرشد بھی نہ لکھتے تو میں کیونکر اطلاع پاتا اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصُول صحت کی دُعا کیونکر مانگتا۔ کل سے وقت خاص میں دُعا مانگ رہا ہوں، یقین سے پہلے تُم تندرست ہو جاؤ گے زاں بعد یہ خط پاؤ گے۔"

غمہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پر دِل نے کبھی تسلّی نہ پائی، اب دو باتیں سوچا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب جیتا ہوں یوُں ہی رویا کروں گا، دوسری یہ کہ آخر ایک دِن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دِلنشین ہے۔ نتیجہ اس کا تسکین ہے۔"

خُدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مُجھ تنگ آفرینش کو خاصان درگاہ سے بھلا کہلواتا ہے ظاہرا میرے مقدّر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی کہ میں اس وبائے عام میں جیتا رہا۔ اللہ اللہ! ایسے کشتنی و سوختنی کو یوُں بچایا اور پھر اس رُتبے کو پہنچایا۔ واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمایئے گا، ورنہ بندہ دعوائے خدائی کرنے میں محابا نہ کرے گا"

"تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا، جو بُوئے پیرہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں۔ یا جوان ہیں، توانا ہیں۔ یا ناتواں ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہرحال غنیمت ہیں۔

وہی بالا خانہ ہے۔اور وُہی میں ہوں سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے۔ وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ میرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں کا اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔؟''

''دوجانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعُبہ ہے انہیں ظنون کا، جن سے تُمہارے چچا (ضیاءالدین احمد خاں نیّر) کو گمان ہے، مجھ پر جنون کا، جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بُلاتا۔ گویّا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لیکر چلا جاتا۔ دوجانہ جاکر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا گُرّہ نار ہو لوہارو بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو۔''

''اُستاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پُھوپھی انکی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عُمر میں چھوٹے ہیں دُعا، اور اس وجہ سے کہ دوست ہیں۔ اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام، اور اس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں، بندگی، اور اس نظر سے کہ یہ سیّد ہیں، دُرود اور موافق اس مصرع کے

''سوی اللہ واللہ مافی الوجوُ د''، سجُود۔''

''شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہوجاتے ہیں۔ تو آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخن ور ہو گئے۔ حُسن طبع خُدا داد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخ کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پر غمزدہ دلِ مُردہ کو تکلیف دو۔؟ علاؤالدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخ نظم کر دیا تھا۔ اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو وہم نے گھیرا ہے۔ کہ میری نحوست طالع کی تاثیر سے میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ (والیان اودھ) ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر سنبھل نہ سکے۔ جس کی مدح میں دس

بیس قصیدے کہے۔ وہ عدم سے بھی پرے پُہنچا۔ صاحب! دہائی خُدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ تاریخی نام ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے۔ اور عمر و دولت اور اقبال عطا کرے۔''

''تمہارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کی نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا۔ لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسا مُسلمؓ بن عقیلؓ کا حال کوکوفہ میں تھا۔''

کل تمہارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دہلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں جس میں تُم پیدا ہوئے۔ وہ دلّی جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنوُد۔''

باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی۔ مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں، ممکن نہیں دروازے سے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ ''یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیائی کے ہیں۔'' مراد ہے امین الدین احمد خاں والی لوہارو سے جو بیگم غالب کے چچیرے بھائی تھے۔

''ڈاک کا ہرکارہ حویلی کے خطوط پہنچاتا ہے ان دنوں بینا، پڑھا لکھا، حرف شناس کوئی فلاں ڈھمک داس ہے۔''

''میں بالاخانے پر رہتا ہوں حویلی میں آکر اس نے داروغے کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مُبارک ہو آپکو جیسا کہ دلّی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا اب کا یہی خطاب کپتانی کا ملا حیران، کہ کیا بکتا ہے۔ سرنامے کو غور

سے دیکھا کہیں قبل از اسم ''مخدوم نیاز کیشاں'' لکھا تھا۔اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع
نظر کر کے ''کیشاں'' کو'' کپتان'' پڑھا۔''

یہاں آدمی کہاں ہے۔کہ اخبار کا خریدار ہو۔مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں۔ یہ
ڈھونڈتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں بہت سخی ہونگے تو جنس پوری تول دینگے۔ کاغذ
روپے مہینے کا کیوں مُول لیں گے؟''۔

''بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔قلعہ، چاندنی
چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں
کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔''

''غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شُکر، کس منہ سے ادا کروں؟ ایک دریا ہے
کوسی، سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔صاف سُبک،
گوارا، سریع اُلنفوذ۔''

''آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔بس اب اس سے زیادہ یاس کیا
ہوگی کہ بہ امید مرگ جیتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا
ہے؟ چاہے الہام سمجھئے، چاہے اد ہام سمجھئے۔بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے

من کہ باشم کہ جاوداں باشم
چوں نظیری نہ ماند و طالب مرد
ور بہ پرسند در کرا میں سال
مُردِ غالب؟ بگوکہ ''غالب مرد''

اب بارہ سو پچھتر ہیں اور غالب مُرد کے بارہ سو ستہتر ہیں۔اس عرصے میں جو کچھ
مُسّرت پہنچی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں؟

بھائی صاحب!

ساٹھ برس سے ہمارے تمہارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں، رنج کا میرا تمہارا
مُعاملہ یہ کہ پچاس برس سے تم کو چاہتا ہوں بے اسکے کہ چاہت تمہاری طرف سے بھی ہو۔
چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔میں تمہیں چاہتا رہا تم مجھے چاہتے رہے وہ امر
عام اور یہ امر خاص کیا حقیقی اسکا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا
ہوجائے؟ وہ قرابت اور یہ مودت کیا پیوند خُون سے کم ہے؟ مگر کیا کروں، مبالغہ نہ سمجھو میں
ایک قالب بے روح ہوں

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اضمحلال رُوح کا روز افزوں ہے۔صُبح کو تبرید، قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب۔
اگر اس میں سے جس دِن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی، میں مر گیا۔واللہ نہیں آسکتا، باللہ نہیں
آسکتا۔دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔
محبت نہ سہی، عداوت بھی تو نہ ہوگی۔آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدّولہ اور
فخر الدّولہ کی جگہ ہو۔ میں لَم یَلِدُ وَلَم یُولَدُ ہوں۔ میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے
تمہارے بچے ہیں۔خود جو میری بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے
واسطے بلکہ بیکسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں۔اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔تمنا ہی ہے
اور انشاء اللہ ایسا یہ ہوگا۔کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے میں مر جاؤں تا کہ اس قافلے
کو اگر روٹی نہ دو گے۔ چنے تو دو گے اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا
سے۔میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ اُلجھوں گا۔

جناب والدہ ماجدہ تمہاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاء الدین احمد خاں اسی واسطے
وہاں پہنچتے ہیں۔سُو بعد تبدیل آب وہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں، کثرتِ اطبا،

صحبتِ احبا، تنہائی سے نہ ملول رہو گے، حرف و حکائیت میں مشغول رہو گے۔ آؤ آؤ، شتا آؤ بھائی۔

میرزا علاؤالدین خاں! تم کو کیا لکھوں؟ جو وہاں تمہارے دل پر گزرتی ہوگی۔ یہاں میری نظر میں ہے خیر دُعائے مزید عُمر و دولت۔

اخ مکرم کے خدام کرام کی خدمت میں بعد اہدائے سلام مسنون ملتمس ہوں۔ تمہارا شہر میں رہنا موجب تقویت دل تھا۔ گو نہ ملتے تھے پر ایک شہر میں تو رہتے تھے۔

بھائی ایک سیر دیکھ رہا ہوں، کئی آدمی طیور آشیاں گم کردہ کی طرح ہر طرف اُڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں۔ لو صاحب اب وعدہ کب وفا کرو گے؟ علائی کو کب بھیجو گے ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بارش شروع ہوجائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کہے گا میں رہرو چالاک ہوں۔ تیراک نہیں لوہارو سے دہلی تک کشتی بغیر کیونکر جاؤں؟ دخانی جہاز کہاؤں سے لاؤں؟

اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

اُستاد میر جان صاحب کو سلام

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت!

تمہاری تفریح طبع کے واسطے ایک غزل نئی لکھ کر بھیجی ہے۔ خُدا کرے پسند آئے اور مطرب کو سکھائی جائے۔ آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں، سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں۔ کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اوّل روز بڑے روز کی آندھی آئی۔ پھر خُوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرّہ زمہریر ہوگیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹڑے کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہوگئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے

ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور پیل تن بندر ہوا ہے۔ مکانات جابجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں۔ جن کو عوام گمزی کہتے ہیں انہیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھادی۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر! ریگستان کے ملک سے ایک سردارزادۂ کثیر العیال عسیر الحال، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے۔ ملّی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیتا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کیئے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ غالب علی شاہ درویش کے تکیے پر آجاتا ہے۔ اہل شہر حیران ہیں کہ کھاتا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ باپ سے پھر گیا ہے، میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے۔ دیکھیئے انجام کار کیا ہو۔ غالب علی شاہ کا قول یہ ہے کہ کل کا بھلا ہو۔

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت!

بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامہ کی رو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ تیسری غزل ''گو ہر نتواں گفت'' ''اختر نتواں گفت'' جو تمہارے حسب الطالب بھیجی گئی ہے کیا نہیں پہنچی۔ بے شُبہ پہنچی ہوگی۔ تم بھول گئے ہوگے۔ وکیل حاضر باش دربار اسد اللہی یعنی یلائی علائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے۔ جھنجوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آکر بھی سُن لوُں گا۔ والسلام مع الاکرام

غزل

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرت ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بُت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مُضطر میرا
کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آب بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

☆

بھائی صاحب!

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہارِ غم۔ تلقین صبر، دُعائے مغفرت، سو بھائی اظہارِ غم تکلیف

محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسروں کو ہوا ہو تلقین صبر بیدردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے۔ جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کیا تلقین کی کی جائے۔ رہی دُعائے مغفرت میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربیہ و محسنہ تھیں۔ دل سے دعا نکلتی ہے معہذا تمہارا یہاں آنا سُنا جاتا تھا، اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہوا کہ دُشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور اس سبب سے آنا نہ ہوا۔ یہ چند سطریں لکھی گئیں حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت

بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے۔ کہ اُستاد میرن جان آئے اور ان کی زبانی تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ خُدا تم کو زندہ و تندرست و شاد و شاد ماں رکھے۔ یہاں کا حال کیا لکھوں؟ بقول سعدی علیہ الرحمۃ (نہ ماند آب جز چشم دریتیم) شب و روز آگ برستی ہے یا خاک۔ نہ دن کو سورج نظر آتا ہے نہ رات کو تارے۔ زمین سے اُٹھتے ہیں شعلے آسماں سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ نادان! قلم انگریزی دیا سلائی کیطرح جل اُٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے۔ گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے وہ اور بھی جان گزا ہے۔ خیر اب فصل سے قطع نظر ایک کودک غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جاں سوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ میرزا آیا اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوُچھا کہ کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپکا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ کہا جناب عالی آ کا جان کی تنخواہ آ گئی ہے میری نہیں آئی۔ میں نے کہا تو لوہارو جائے تو تنخواہ پائے۔

کہا حضرت میں تو آ کا جان سے روز کہتا ہوں کہ لو ہار وچلو اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی
رعیت میں کیوں مل گئے؟ سبحان اللہ! بالشت بھر کا لڑکا اور یہ مہم درست اور طبع سلیم۔
میں اس خوبع خو اور فرخی سیرت پر اسکو فرخ سیر کہتا ہوں۔ مصاحب بے بدل ہے تم اسکو
بلا کیوں نہیں بھیجتے؟ مگر بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبع ہو کہ زین العابدین وحیدر
حسن اور ان کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا۔ علاؤ الدین خاں جیسا ہوشمند رہمہ دان بیٹا فرخ
سیر جیسا دانشور، بذلہ سنج اور شیریں سُخن پوتا۔ یہ دو عطیہ عظمٰی و موہبت کبریٰ ہیں۔
تمہارے واسطے من جانب اللہ

اگر دریافتی برداشت بوس
دگر غافل شدی! افسوس افسوس

آج بدھ کے دن ۲۷/رمضان کو پہر دن چڑھے کہ جس وقت میں کھانا کھا کر باہر
آ رہا تھا۔ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط اور شہاب الدین خان کا خط معاً لایا۔ مضمون دونوں کا
ایک۔ واہ کیا مضمون! ان دنوں میں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں ایک داغ
جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سبحان اللہ میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی
تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا
کرے۔ میاں اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔
لوگوں کے دیے ہوئے مادے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ
بیشتر لچر ہوا کرتا ہے چنانچہ اپنے بھائی کی رحلت کا مادہ ''دریغ دیوانہ'' نکالا۔ پھر اس میں
سے ''آہے'' کے سولہ عدد گھٹا دیے۔ تمام دو پہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مادہ
ڈھونڈا۔ تمہارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تا کا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں۔
بارے ایک قطعہ درست ہوا۔ مگر تمہاری زبان سے گویا تم نے کہا ہے پانچ شعر ہیں۔ تین

شعر زائد، دو موضح مدعا، لیکن میں نہیں جانتا کہ تعمیہ اچھا ہے یا برا۔ ہاں اغلاق تو البتہ
ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے۔ اور شاید لوح متزار پر کھدوانے کے قابل نہ ہو۔

قطعہ

در گر یہ اگر دعوی ہم چشمی کرد
بنی کہ شود ابرِ بہاری خجل ازما
ناچار بگر یئم شب و روز کہ ایں سیل
باشد کہ برد کا لبد آب وگل ازما
گفتی کہ نگہدار حل از کشمکش غم
خود گرد بر آور دغم جاں گسل ازما
یحییٰ شدہ ازشولۂ سوز غم ہجرش
چوں شمع دود دود بسر متصل ازما
غم دیدہ نسیمی پئے تاریخ وفاتش
بنوشت کہ در داغ پسر سوخت دل ازما

''ما'' کے عدد ۴۱ ''دل'' کے عدد ۳۴ ''ما'' میں سے دل گیا، گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گئے۔
باقی رہے سات۔ وہ ''داغ پسر'' پر بڑھائے، ۱۲۷۴ ہاتھ آئے

خاک نمنا کم و تو یاد بہار
نہ توانی مرا زجا بردار

ہاں ''نسیمی'' زمن چہ می خواہی ....زحمت خوشیتن چہ می خواہی۔ خوشی مجھ میں تجھ میں
مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمہیں تہنیت دی تو مناسب، اللہ
الحمد اللہ الشکر۔ بھائی، سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ

بھیجوں تو کہار ماندہ اُٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدۂ ماجد اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں۔ مجھ سے لےلو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا۔ وہاں رو گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا چل دیا

تا درمیانہ خواستہ کہ دگار چیست

کہ اس ترکیب سے لفظ ''نالائق'' پیدا ہوتا ہے۔ مولانا ''شائق'' بن جاؤ گے۔

ہنسی کی باتیں ہوچکیں۔ اب حقیقت واجبی سنو۔ ''نسیمی'' تخلص خماسی بروزن ''ظہوری'' و ''نظیری'' اچھا ہے۔ اگر بدلنا منظور ہے۔ تو ''نامی'' ''سامی'' ''رہرو'' ''شیون'' یہ چار تخلص رباعی بروزن ''عرفی'' و ''غالب'' اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو۔ میرے نزدیک سب سے بہتر تمہارے واسطے خاص ''فخری'' تخلص ہے۔ کہو گے کہ آزاد پور کے باغ کے ایک آم کا نام ''فخری'' ہے۔ حاصل کلام دو دن کی فکر میں جو تخلص میرے خیال میں آئے۔ وہ آج لکھ بھیجتا ہوں۔ بھائی ''موبد'' تخلص نیا ہے۔ اگر یہ پسند آجائے تو یہ رکھو۔ والدعا۔

سبحان اللہ! ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ مجھ سے کتاب مُستعار مانگتے ہو! یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ ''دساتیر'' اور ''برہان قاطع'' کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازاں جُملہ ''برہان قاطع'' تم کو دے چکا ہوں۔ ''دساتیر'' میرا ایمان وحرز جان ہے۔ اشعار تازہ مانگتے ہو۔ کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے۔ جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ بھٹئی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟

بوڑھے پہلوان کے سے۔ پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں۔ اصلاح پاتے ہیں۔ یاور کرنا اور مطابق واقعہ سمجھنا۔

تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرہ گیا ہے وہاں منطبع ہوگا ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو

مجھ کو بھی پوچھتے رہو کیا گناہ ہو

میری جان تخلص تمہارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔ ''پشمی'' کو بہ تکلف اس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ؟ یہ میدان تو بہت فراخ ہے خدا کی کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو تیقدیم موحدہ علی النون لکھو۔ یہ وساوس دل سے دور کرو۔ ''رہرو'' ایک اچھا تخلص ہے ''رہڑو'' اسکی تجنیس موجود ہے۔ ''شیون'' اچھا تخلص ہے ''ستون'' اس کی تصحیف ہے۔ تمہارے واسطے بمناسب اسم عالی تخلص خوب تھا۔ مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں ''نامی'' ''سامی'' یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ مولانا ''فائق'' کی پیروی کرو۔ مولانا ''لائق'' کہلاؤ۔ اگر کہو گے

میری جان علائی ہمہ دان!

اس دفع دخل مقدر کا کیا کہنا ہے۔ فرہنگ لغات دساتیر تمہارے پاس ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اسکی نقل تم سے منگاؤں۔ تم نے ''دساتیر'' مجھ سے مانگی۔ اسی صحیفہ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہو گے کہ اگر ''دساتیر'' نہیں تو ''فرہنگ'' کی خواہش کیوں ہے؟ حق تو یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اس ''فرہنگ'' کی نقل بھیج دو گے تو مجھ پر احسان کرو گے۔ ''دساتیر'' میرے پاس موجود ہوتی تو

آج اس خط کے ساتھ اسکا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب اگر دساتیر ہوتی اور میں بھیج دیتا۔تو البتہ بھائی صاحب کا مشکور ہوتا۔دین ودنیا میں کیوں ماجور ہوتا؟ ارسال اہدا پر حصول اجر کیوں مترتب ہوگیا؟ بھائی ہو مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں۔اورتم اس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اس کے اعلان وشیوع کا ہوتا تو عنداللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر حافظ کا اور ایک شعر مولوی روم کا سناؤ۔

غالب

دولت بہ غلط نبود از سعی پشمان شو
کا فر نتوانی شُد، ناچار مُسلمان شو

حافظ

جنگ ہفقاد دو ملت ہمہ را غدرنیہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہ اِفسانہ زدند

مولانا روم

مذہب عاشق زمذہبہا جداست
عاشقاں رامذہب و ملّت خداست

رات کوخوب مینہ برسا ہے صبح کو تھم گیا ہے ہوا سرد چل رہی ہے ابر تنک چھا رہا ہے۔ یقین ہے کہ تمہاری جدّہ ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانۂ لوہارو ہوں۔کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعید ازلی ہے ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہوجانا خاص اسکی آسائش کے واسطے ہے میرا منظر سرراہ ہے۔ وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں۔حضرت ابھی نہیں کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضُرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے۔

جانِ غالب!

یاد آتا ہے کہ تمہارے عم نامدار سے سنا تھا کہ لغات ''دساتیر'' کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ بھیج دیتے خیر

آنچہ مادر کار داریم اکثرے درکار نیست

تم ثمر نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو ونما پائی ہے اور میں ہوا خواہ وسایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں۔کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ رہی دیدوادید۔ اس کی دوصورتین ہیں تم دلّی میں آؤ میں لوہارو آؤں۔تم مجبور میں معذور۔خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے؟ سُنو عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب وگل۔حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔جو خود فرماتا ہے۔لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے۔للہ الْوَاحِدِ الْقَہار۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے۔کہ آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔لیکن یوں بھی ہوا ہے۔کہ عالم ارواح سے گنہگار کو دُنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔فکر نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔تین برس بلادشرقیہ پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔پانو بیڑی سے نگار ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔مشقت مقرر اور مشکل ہوگئی۔طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔بے حیا ہوں۔سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ

پھر پکڑا گیا۔ اب عہد کیا تھا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی نہ
رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو ایک ضعیف سا احتمال ہے۔ کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ
میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر اور کہیں نہیں جاتا۔ میں
بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

علائی مولائی!

اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ اُدھر پڑھا۔ اِدھر جواب لکھا۔ واہ کیا کہنا ہے؟ رام پور کے
علاقہ کو گاؤشنگ اور مجھ کو بیل یا اس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنایا۔ وہ علاقہ اور وہ
پیوند لوہارو کے سفر کا مانع ومزاج کیوں ہو؟ رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں
معین نہیں ہوں۔ جس طرح امراء واسطے فقراء کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں اسی طرح اس
سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دُعائے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب
ہے۔ چاہوں دلّی رہوں۔ چاہوں اکبر آباد۔ چاہوں لاہور۔ چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی
کپڑوں کے واسطے کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کہار
ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لوں۔ چل دوں۔ رام پور
سے جو لفافہ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی
کھانے کو باہر کے مکان سے محلسرا میں کہ وہ بہت قریب ہے۔ جب جاتا ہوں تو ہندوستانی
گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے۔ اور یہی حال دیوان خانے میں آ کر ہوتا ہے۔ والئی رام پور نے
بھی تو مرشدزادہ کی شادی میں بُلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں۔ تمہارا
اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔ بھائی کے اور
تمہارے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ پر کیا کروں عقرب وقوس کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر
میں قصد تو کروں گا۔ کاش لوہارو کی جگہ گوڑ گانو ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو گے کہ رام پور کیا

نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انحطاط واضمحلال روز افزوں۔ نہ تم یہاں
آ سکتے ہو۔ نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں اخیر حملہ چل گیا۔ بہتر ورنہ

اے وائے زمحرومی دیدار و دگر ہیچ

میری جان کیا چاہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈ ہو گئی۔ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ فصل اچھی
ہو گئی۔ اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیع جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا خرقہ پایا، سجدو سجادہ کا یہاں پتا
نہیں۔ ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہنچ
گئے۔ آخر اکتوبر میں یا آغاز نومبر میں نیرّ رخشاں کو بھی وہیں لو۔ پھر عقرب وقوس سے
آفتاب کا کیا ذکر؟ آبان ماہ آذر ماہ سے کیا غرض؟ بسے تیرودے ماہ واردی بہشت۔ برآید
کہ ماخاک باشیم وخشت۔ آستاد میر جان کو، اُس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور
وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں دُعا اور اس رو سے کہ دوست میں اور دوستی میں کمی بیشی سن و
سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام اور اس سبب سے استاد کہلاتے ہیں بندگی اور اس نظر سے
کہ یہ سید ہیں درود اور موافق مضمون اس مصرع کے

سوے اللہ واللہ ، مافی الوجود

حضرت وہ ''شرف نامہ'' نہیں ہے کس احمق نے شرف نامہ میں سے کچھ لغات، اکثر
غلط، کمتر صحیح، چُن کر جمع کیئے ہیں۔ نہ دیباچہ ہے۔ کہ اس سے جامع کا حال معلوم ہو، نہ خاتمہ
ہے کہ عہد وعصر کا حال کھلے۔ بایں ہمہ میاں ضیاء الدین کے پاس ہے۔ اگر وہ آ جائیں گے تو
ان سے کہہ دوں گا۔ اگر وہ لائیں گے تو ان کی قیمت دے کر علائی مولائی کو بھیج دوں گا۔
خصّی بکروں کے گوشت کے قلیے دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو مجھ کو
خُدا کی قسم اگر اس کا خیال بھی آتا ہو۔ خُدا کرے۔ بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا تم کو مُیسر نہ آیا ہو۔
کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں

میں رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔

صاحب!

صبح جمعہ کو میں نے تم کو خط لکھا۔ اسی وقت بھیج دیا پہر دن چڑھے سنا کہ شب کو پھر دورہ ہوا۔ گیا خود ان سے حال پوچھا محمد علی بیگ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ بہ نسبت دورہ ہوئے سابق خفیف تھا اور افاقہ جلد ہو گیا۔ کل مرزا شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین کہتے تھے کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں۔

غالب کی اصل محبوبۂ دلنواز

دستور! کیا پوچھتے ہو غالب خستہ کا حال تیرہ چودہ سال کی عمر میں میری شادی دہلی کے امیر الدین خاندان کے نواب الٰہی بخش خاں کی نوجوان صاحبزادی سے ہوئی اور میں آگرے سے دہلی اپنی سسرال آگیا۔ عام طور پر شادی کے بعد دولہن میکے میں رخصت ہو کر اس کے گھر جاتی ہے مگر میں دولہا بن کر دولہن کے گھر داماد نہ رخصت ہو کر اپنے سسرال میں جا لیا مگر گھر داماد نہ ہوا بلکہ دہلی میں بود و باش اختیار کرنے کے باوجود بلی ماران کے محلّہ میں ایک علحدہ بڑی حویلی میں اپنی بیگم اور نوکروں کے ساتھ رہائش پذیر ہوا۔ میرے ملازمو ں میں دہلی سے چند مردوں کے علاوہ میرے دو قدیم خاندانی ملازم۔ ایک کالے خاں عرف کلو اور دوسری ماما بی وفادار میری زندگی بھر ساتھ رہے میری فطری و ادبی و شعری صلاحیتوں پر اس خوشگوار ماحول کا بہت اچھا اثر ہوا۔ اور میرا انداز فکر بدلا اور شاعری کو نئی تازگی ملی۔ میں نے اپنے اسلوب شاعری کو فرسودہ انداز سے بیگانہ اور یگانہ صفت رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ میں اپنی محبوبہ کے سامنے ہمیشہ عجز و نیاز کا اظہار نہیں کرتا بلکہ میری فطری انا اکثر مواقع پر میرے آڑے آتی ہے۔ یہ خود ستائی نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہے کہ میں نے سن شعور سے

پیرانی سالی تک زندگی سے ہر معاملے میں یگانگت اختیار کی ہے۔ اپنے طرز معاشرت کو ہر طریقہ میں عامیہ روش سے گریز کیا ہے۔ حتیٰ کہ مجھے روش عام میں مرنا بھی گوارا نہیں ہے میرا رہن سہن، خوراک، لباس گفتگو وغیرہ خصوصیت خاصہ کی حامل ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے یگانہ روزگار بنایا اور میری فطری صلاحیتوں کو یگانہ صفات عطا کیں۔ میری شاعری میری اس طرز یگانگت کا آئینہ دار ہے۔ میں اپنی شوخ طبعی کی بدولت محبوبۂ طناز پر کبھی کبھی پھبتی بھی کس دیتا ہوں۔ لیکن ان تمام دعووں کے باوجود مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میں اپنی اس شعلہ خو حسینہ سے مرعوب بھی رہا ہوں جو مجھے اپنی نگاہ گرم سے تعلیم ضبط بھی دیتی ہے میری محبوبہ شوخ و شنگ فتنہ طرز تو ہے لیکن اردو شاعری کی روایتی تشدد پسندی کے خصائل اس میں برائے نام ہیں اور یہ بھی نہایت دلچسپ بات ہے کہ میرا تصور شعری ساکت نہیں ہے۔ میں اپنی محبوبہ کو یگانہ صفت اکثر چلتے پھرتے ہی دیکھتا ہوں ؎

موج خرام ناز بھی کیا گُل کتر گئی
لرزے ہے موج مئے تری رفتار دیکھ کر

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں درم دیکھتے ہیں

اے بہار ناز کہ تیرے خرام سے
دستار گرد شاخِ گلِ نقش پا کروں

میں اپنی شاعرانہ ہستی میں ہوس پرستی کا قائل نہیں بلکہ میرے تمام کلام اردو فارسی میں پردہ مجاز میں حقائق کی جھلک بھی موجود ہے۔ ایک راز کی بات یہ ہے کہ میری شاعری کا پاکیزہ انداز دل آویز دل پذیر اسلوب بیان کسی ستم پیشہ دوستی کے لئے ہی صرف نہیں ہوا تھا۔ آگرے کے قیام میں بے شک بعض دولتمند عیش پسند احباب خوشنودی کی خاطر حسن

لب بام سے مجھے بھی کچھ دلچسپی رہی امیرانہ ماحول رقص کے ذوق وشوق سے یکسر مرا نہیں رہا۔طرز معاشرت کا یہی تقاضہ تھا مگر میرے شعروسخن اور فکروتخیل کا مرکز محض ایک ڈومنی کو سمجھنا سراسر غلط فہمی ہے۔مگر اس غلط فہمی کا خالق خود میری ذات ہے۔جس کی وجہ ایک خاص بات ہے درحقیقت میری شاعری کا بے مثل حسن۔انفرادی بانکپن جس نگاہ ناز کا عطیہ ہے میرے فکروخیال کو جس حسن تمکین نے دلآویزی بخشی وہ میری ہم ذوق وہم خیال ہمدم درماز حور تمثال ناطورہ جمال ایک عالی خاندان معزز وشریف خاندان کی بے نظیر دلربا ہستی کوئی اور ہی تھی۔یہ پردہ نشین خاتون جواں سال ترک نژاد تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ بخارا سے آکر آگرے میں رہائش پذیر ہوئیں ان کے شوہر بغرض تجارت ہندوستان آگئے۔میں نے ان کی جھلک دیکھی تھی اور ایک تقریب میں انہوں نے بھی میری ایک جھلک دیکھی تھی یہ ایام ہم دونوں کی نوجوانی کے تھے میں نامراد اس کے حسن صورت کا ہی نہیں حسن سیرت وذہانت اور زہدوعفت کا بھی گرویدہ تھا۔جس کی اشارت وعبارت میرے قلب ودین پر مسلط اور بلائے جاں تھی جس کے لئے ہیں آشفتہ شعر کہئے بغیر نہ رہ سکا کہ

قہر ہو یا بلا بلکہ جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

لیکن اسی شریف عصمت کا تاب پردہ نشین خاتون کا نام اس کے دل نشین ہونے کے باوجود کچھ بدنصیب کی زبان یا قلم سے کیسے ادا ہوسکتا تھا۔اس لئے کبھی اپنے درددل کو بذلہ سنجیوں میں چھپاتا ہوں اور کبھی ستم پیشہ ڈومنی کا ذکر کرکے احباب کو ٹالتا ہوں۔اس طرح وہ حسین وجمیل وجود دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہا۔جس نے میری شاعری کو رنگین ودلآویز بنایا۔یہ حور تمثال ہستی ذہانت میں بے مثال ہیں اور شعروسخن میں باکمال تھیں۔فارسی میں شعر کہتی تھی اور آگرے کے قیام کے زمانہ میں میری شاگردی قبول کرکے مجھ سے شورۂ سخن کرتی

تھیں میں نے ہی ان کا تخلص ترک رکھا تھا۔میں شادی کے بعد دہلی آگیا اور ترک کے جوان سال شوہر نے وفات پائی۔اس کے بعد ترک نے اپنی بیوگی کا غمگین واندوہگین زمانہ دوگو فراق میں گزارا۔اور اپنی پریشاں حالی والمناک زندگی کے ایام شعروادب کے مشاغل میں بسر کئے کہ اگر میں آزاد ہوتا اور نوعمری میں میرے پاؤں میں قید کی بیڑی نہ پڑی ہوتی تو شاید دونوں کو جدائی کے غم واندوہ سے جائز طور پر نجات مل جاتی۔مگر ہمارے نصیبوں میں داغ ناکامی وفراق دائمی مقدر ہوچکا تھا۔اس سے عمر بھر فراغ میسر نہ ہوسکا۔''ترک'' کی ماما دہلی کے قیام کے ایام میں روزانہ ان کا کلام فصاحت نظام میرے پاس لاتی تھی۔اور میں بعد اصلاح اپنی ماما راز دار کی وفاداری کے ذریعے ان کے پاس بھیجتا تھا۔یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا۔۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامہ میں تنہائی اور مصائب ومشکلات کے باعث ترک کو مجبوراً دہلی چھوڑنا پڑا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بادہ پیمائی وصعوبات سفر کی تاب ترک کا نازک جسم نہ لا سکا اور دوبارہ آگرہ پہنچنے کے چند روز بعد اس قدر بے حال اور نڈھال ہوگئیں کہ یہ علالت میں مبتلا ہوگئیں۔اس غیرتمند معزز وشریف پاک باطن خاتون کی خاندانی عزت وحرمت نے میری اعانت گوارا نہ کی اور بالآخر غم جدائی اور خوف رسوائی سے مجبور ہوکر جاں بحق ہوگئی......
میں بدبخت نامراد وبے حیا زندہ رہا۔دلی کے قیام کے دوران ایک مرتبہ وہ شعلہ خوحسینہ نامعلوم طور پر مجھ سے روٹھ گئی اور میرے نامۂ شوق کا جواب نہیں دیا۔اس ناکامی ونامرادی پر میں بےتاب وبےچین تھا مگر ضبط وصبر سے کام لیا۔تاہم دل نہ مانا تو یہ لکھ کر بھیجا۔

سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ آخر بدگماں کیوں ہو

یہ حقیقت ہے کہ میرے اشعار میں جو دل کی دھڑکنیں ہیں وہ ترک کا عطیہ ہیں کیوں کہ یہ عالی دماغ وبلند پایہ خیالات اور پاکیزہ جذبات کی حامل خاتون ذہنی مناسبت اور ذوق کی ہم آہنگی کی وجہ سے بلاشبہ میرے خیالوں میں بس گئی تھی چناں چہ میرے انداز فکر میں جو خلوص کی

آنچ ہے اور روز بروز اس کی دلآویزی میں اضافہ ہوتا گیا ہے اور میرے کلام کی بناپُر کیف ہے یہ ترک کی پاکیزہ و پُرخلوص محبت کا پرتو ہے۔ میں نے اس پاکباز نیک طبیعت باحیا خاتون کی ایک حسین وجمیل جھلک میں بے اختیار و بیتاب ہو کر جھوم اٹھا تھا اور مجھے بے ساختہ سرمایہ کہنا پڑا تھا

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں تجھے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

میرے بعض ناواقف احباب اور عام نقاد گمان کرتے ہیں کہ میں نے ایک نہیں کئی مرتبہ عشق کیا ہے اور بقول میرے ایک ستم پیشہ ڈومنی کو بھی مار رکھا ہے۔ مگر آج میں اس دلکش و دلپذیر حقیقت کو آشکار کرتا ہوں کہ میں اپنی بدنصیبی سے اس محبوبۂ وفا شعار و خوش اطوار حقیقی مستورۂ ناز و نیاز محبوبۂ دلنواز کو کبھی بھی نہ پا سکا جس سے مجھے واقعی عشق تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر جان و دل سے فدا تھے مگر بدنصیبی کے ہاتھوں جدا تھے اور میری بیؤشی کا بھی یہی سبب ہے۔ جس کا میں برملا اظہار کر چکا ہوں کہ

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گو نہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

میرا داغِ ناتمامی اس شمع کی مشابہہ ہے جسے کسی نے بے دردی سے بجھا دیا ہو گویا

اس شمع کی طرح ہے جس کو کوئی بجھادے؟
میں بھی جلے ہوئے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

غرضیکہ مجھ تفتہ جگر کی زندگی جس حال میں گزر رہی ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ میں اس دعا کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا اگر کچھ کہوں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں سنگِ وجود بڑا بے حیا اور بدنصیب ہوں کہ محبوبہ داغِ مفارقت دے گئی۔ اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور میں جی رہا ہوں۔ شراب کو خونِ جگر کے طور پر پی رہا ہوں۔ اکثر تنہائی میں اس کا مرثیہ پڑھتا ہوں

اور اس کی یاد میں سر دھنتا ہوں

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی آخری تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے نا ساز گاری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
گوشِ مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل اُس پہ یہ نا امید وارحیری
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو تھا ذوقِ خواری ہائے ہائے

......☆......